کوششِ ناتمام

(افسانے)

شائستہ اختر سہروردی

مکتبہ جدید - لاہور

بار اول — ستمبر ۱۹۵۰

قیمت — دو روپے آٹھ آنے

پبلشرز — مکتبہ جدید ۔ لاہور

پرنٹرز — انشا پریس ۔ لاہور

میری خالہ

خورشید طلعت بانو بیگم

کے نام

جن کے ادبی خواب سماج کی جکڑ بندیوں
کی وجہ سے شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے۔

فہرست

دیباچہ

شائستہ سہروردی (بیگم اکرام اللہ) تعارف کی محتاج نہیں۔ مگر افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کی شہرت ابھی تک ایک مخصوص طبقہ تک ہی محدود ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس مجموعہ کے شائع ہونے پر ان کی ادبی شہرت کا دائرہ اور بھی وسیع ہو جائیگا۔

بیگم اکرام اللہ ان افسانوں میں زندگی کے ان مسائل اور پہلوؤں کو پیش کرتی ہیں جن پر انہیں پورا عبور حاصل ہے۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کو ایک مرد اس خوبی اور خوش اسلوبی سے پیش نہیں کر سکتا۔ جہاں تک کہ عورتوں کی زندگی ان کی مشکلات اور خواہشات کا تعلق ہے، شائستہ سہروردی کا مطالعہ بہت

کوشش ناتمام

گہرا اور وسیع ہے۔ وہ فرا ذرا سی باتیں جو اوروں کی نگاہوں سے اکثر او جھل رہ جاتی ہیں اور جو موقع موقع پر افسانہ کی جان ہوتی ہیں بیگم اکرام اللہ کے افسانوں میں جا بجا ملتی ہیں اور ان کی خوبی بڑھا دیتی ہیں۔

زندگی، اخلاقی اور معاشی کروٹیں بدلتی رہتی ہے، لیکن وہ جذبات جو قلب انسانی کو تڑپاتے اور رنج آلود کرتے رہتے ہیں کبھی نہیں بدلتے۔ یہ افسانے عورتوں کے ان جذبات سے تعلق رکھتے ہیں جن کو ہمارے ہاں کے مرد اکثر و بیشتر سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں اور جن کی بنا پر تلخی اور ناکامی کے احساس میں اتنا کچھ اضافہ ہو جاتا ہے ہماری عورتوں کی زندگی دردانگیز اور رنج و محن سے بھری ہوئی ہے۔ ان کی اور مردوں کی زندگی میں نمایاں تضاد ہے۔ ہمارے مرد یا تو صحیح تعلیم کی کمی یا سوسائٹی کی دقیانوسی قدروں کے باعث عورت کے جذبات اور اس کی امنگوں اور خواہشات کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ پہلے عورت کی دنیا چہار دیواری تک محدود تھی اور مرد کی دنیا اس سے بالکل مختلف اور نسوانی زندگی کی معاشی قیود سے آزاد تھی۔ دونوں علیحدہ علیحدہ دنیاؤں میں رہتے تھے۔ یہ دنیائیں صرف کناروں پر ملتی تھیں اور پھر الگ ہو جاتی تھیں۔ زمانہ کی تبدیلیوں کے باوجود یہ حالت بڑی حد تک اب بھی قائم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مردوں کی سائیکالوجی

دیباچہ

اوروں سے بالکل مختلف ہے۔ جب تک اس میں تبدیلی نہیں ہوگی عورت کے احساسِ درد و ناکامی اور سوسائٹی کی اخلاقی ابتری میں بھی کمی مشکل ہے۔ اور جب تک کہ ہماری عورتیں ان باتوں کو دنیا کے سامنے پیش نہیں کریں گی ہم ترقی نہ کر سکیں گے۔

شائستہ سہروردی کے افسانے ان مسائل کو بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی دنیا اسی وجہ سے شاید محدود سی ہے لیکن ان حدود کے اندر وہ اس کے تمام پہلوؤں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں کی خوبی اور کامیابی اسی سے ہے، اور یہی ان کی دنیا میں درد و گداز اور ایک خاص لطافت پیدا کر دیتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ یہ افسانے ہر طبقہ میں مقبول ہوں گے۔

احمد علی

کراچی۔ اپریل ۱۹۵۰ء

"آزاد چڑیا"

"تو پھر اب کے پوجا کی چھٹیوں میں بھی کہیں لے جانا نہ ہوگا؟"

"ہاں ثریّا تمہیں سمجھایا تو کہ پوجا کی چھٹی صرف دس دن کی ہوتی ہے اور میں اس وقت اور چھٹی لینا مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ آجکل میں سپرنٹنڈنٹ کی جگہ کام کر رہا ہوں اس وقت چھٹی لے لی تو اس کا اثر اچھا نہیں ہوگا۔ اب کے کرسمس پر..."

لیکن ثریا نے جمیل کا جواب ختم ہونے سے پہلے منہ پھیر لیا اور بظاہر سنگھار میز کی چیزیں ٹھیک کرنے میں مصروف ہوگئی۔ لیکن دراصل وہ بڑی مشکل سے آنسو روک رہی تھی۔ جمیل نے غور ہی نہیں کیا کہ ثریا نے جواب سنا بھی یا نہیں اور اس کے دل پر اس کا کیا اثر ہوا۔ بات ختم کرنے پر اخبار پڑھنے لگا۔

کوششِ ناتمام

ثریّا اپنے اوپر قابو پانے کے چند منٹ بعد تک پلنگ کے ایک کونے پہ بیٹھی رہی کہ شاید جمیل پھر کچھ ذکر چھٹیوں کا کرے لیکن یہ دیکھ کر کہ وہ برابر اخبار کے مطالعہ میں منہمک ہے دبے پاؤں وہ کمرے سے چلی گئی۔

ستمبر کا مہینہ تھا۔ کلکتہ میں یہ مہینہ کتنا خراب ہوتا ہے یہ صرف وہی جانتے ہیں جو اس زمانہ میں وہاں رہے ہوں حبس اور گرمی سے دم گھٹ رہا تھا۔ ثریّا ٹھنڈی ہوا کی تلاش میں ایک کھڑکی سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا مکان ایک تنگ گلی میں تھا۔ دوسرے مکانوں بلکہ فلیٹ کے بلاکس کی دیواروں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا اور اگر نظر بھی آتا تو ثریا کی نظریں دیکھ نہ سکتی تھیں کیونکہ وہ اپنی پانچ سالہ ازدواجی زندگی کی تصویریں دیکھ رہی تھی کتنی دفعہ ان پانچ سالوں میں جمیل نے اسی طرح اس کی امیدوں پہ پانی پھیرا تھا۔ ثریا کو سیر کا کتنا شوق تھا۔ بچپن سے ریل کی مستانہ وار چال سے اس کو ایک طرح کا عشق تھا۔ انجن کی سیٹی اس کے لئے رومان کی دنیا کی کلید تھی لیکن یہ شوق کبھی پورا نہ ہونے پایا تھا۔ کرسمس، ایسٹر، پوجا، محرم کی چھٹیاں آتیں اور چلی جاتیں۔ ہر چھٹی سے پہلے وہ جمیل کی خوشامدیں کرتی کہ اسے کہیں لے چلے۔ کشمیر۔ دارجلنگ۔ مسوری۔ اچھا نہیں تو کلکتہ کے پاس ہی کی جگہ پوری، گوپال پور وغیرہ۔ یہ بھی نہیں تو رانچی۔ مدھوپور یا سمیل تلہ ہی سہی۔ لیکن

آزاد چڑیا

ان تین چھوٹے چھوٹے کمروں اور اس تنگ گلی سے نکلنا تو ہو۔ اس کی ہمسایہ بنگالی عورتیں ہر سال پوجا اور کرسمس کی تعطیلوں میں سیر کو جایا کرتیں اور واپس آکر اکھڑی اکھڑی اردو میں اس کو اپنی سیر کا حال سنایا کرتیں۔ وہ سنتی اور دل مسوس کر رہ جاتی۔ ہری ہری پہاڑیاں۔ دلفریب جھرنے نغمہ بار آبشار۔ اس کی نظروں میں پھر جاتے وہ چشم تصور سے موجیں مارتا ہوا حسین سمندر دیکھنے لگتی۔ لیکن یہ خواب کبھی حقیقت کا جامہ نہ پہنتے۔ ہمیشہ خواب ہی رہتے۔ جمیل ہر سال وعدہ کرتا کہ وہ کرسمس یا ایسٹر یا پوجا کی تعطیل میں دارجلنگ۔ کشمیر۔ مسوری لے جائیگا۔ جب وہ بڑے وثوق کے ساتھ اسے یقین دلاتا تو ثریا کے دل میں امنگ کی ایک لہر دوڑ جاتی۔ اپنے دن اس خیال میں گزارتی کہ کس طرح وہ کشمیر میں چھٹیاں گزارے گی۔ کس قسم کے کپڑے پہنے گی کس کس طرح سیر کرے گی اور جب وقت آتا تو جمیل کسی نہ کسی بہانے سے اپنا وعدہ توڑ دیتا۔ اس وقت چھٹی کی گنجائش نہیں تھی اور لوگ چھٹی پہ گئے ہوئے تھے۔ کام زیادہ تھا۔ اس وقت چھٹی پر مصر ہونے کا اثر افسروں پر بہت برا پڑے گا۔ اس وقت وہ ایسے کام پر لگایا گیا ہے کہ اگر اس کو بخوبی انجام دے لیا تو آئندہ ترقی کی امید ہے یا یہ کہ اس وقت افسر خود چھٹی پر گیا ہوا ہے اور اگر دو چار دن کے لئے چھٹی لے کر کہیں گئے بھی تو فائدہ کیا۔ ثریا ملک کر

کوششِ ناتمام

کبھی نہیں چلئے دو چار دن ہی کو سہی لیکن ضرور چلئے۔ اچھا کشمیر مسوری دور ہیں
خیر تو ڈلہوزی ہو آئیں دارجلنگ تو صرف ایک دن کا راستہ ہے وہیں چلے چلئے لیکن
جمیل ٹال دیتا "ارے بھئی تم تو ایسی بے صبر ہو ذرا ٹھہر جاؤ۔ دو مہینے کی چھٹی لے کر
کشمیر چلے چلیں گے۔ بالکل نئی جگہ ہے یا دیکھو تین مہینہ کی چھٹی مل گئی تو چین جاپان
دیکھ آئیں گے یا تین مہینے میں تو یورپ بھی . . . . "

ثریا کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگتیں۔ اس کے متحرک تخیل میں طرح طرح کی
تصویریں ناچنے لگتیں لیکن افسوس اس کے بعد جب چھٹی کا موقعہ آتا جمیل پھر کوئی
تازہ عذر پیش کرتا۔ اس امید میں کہ جمیل ہی اسے لے جائیگا ثریا نے کئی موقعے کھو
دیئے جب وہ اپنے بھائی یا کسی سہیلی کے ساتھ کہیں جا سکتی تھی۔ جب اس کے
بھائی احسان کا خط آیا کہ ہم لوگ مسوری جا رہے ہیں تم بھی آجاؤ۔ سب ساتھ
چلیں گے اور ثریا نے جانا چاہا تو جمیل نے ثریا کو یہ کہہ کر نہ جانے دیا کہ خواہ مخواہ دوسروں
کا احسان کاہے کو اٹھاؤ۔ میں تو کہہ رہا ہوں اس دفعہ پوجا کی چھٹی میں ضرور تمہیں
مسوری لے جاؤں گا۔ ستمبر کا مہینہ پہاڑوں میں بہترین مہینہ ہوتا ہے۔ ستمبر اکتوبر
دو مہینے رہیں گے اور ثریا نے کہا وہاں سے پیدل چل کر شملہ جائیں گے۔ ابھی میں
نے ایک رسالہ میں کسی کا مضمون پڑھا ہے بڑا ہی لطف کا سفر ہوگا اور بہت سینری

آزاد چڑیا

خوبصورت ہوگی۔" تم سچ کہہ رہے ہو۔ سے چلو گے نا؟" "ہاں ہاں ثریا میں
جھوٹا تھوڑی ہوں۔ اتفاق ایسا ہوتا رہا ہے کہ میں اپنے وعدے پورے نہ کر سکا
اس دفعہ ضرور ہی انشاء اللہ تمہیں مسوری کی سیر کراؤں گا" یہ گزشتہ مئی کی بات تھی
پندرہ مہینے گزر گئے۔ ستمبر آیا اور نکل گیا۔ کرسمس کی چھٹیاں بھی ختم ہو گئیں۔ ایسٹر اور
محرم کی تعطیلات بھی گزر گئیں۔ اور اب پھر پوجا کی چھٹیوں میں دارجلنگ جانے
کا وعدہ جمیل نے یہ کہہ کے ٹال دیا کہ وہ اس وقت کسی کی عیوضی کر رہا تھا۔ اور اگر
اس موقعہ پر چلا گیا تو اس کی ترقی رک جائے گی۔ ترقی! ترقی!!! افسروں کی خوشنودی
افسروں پر اچھا اثر پڑے۔ یہ جمیل کی کوشش اور اس کی دلی خواہش تھی۔ اس کی عمر
صرف بتیس سال کی تھی۔ نو سال کی نوکری میں وہ آفس سپرنٹنڈنٹ ہو گیا تھا ساڑھے
چار سو روپیہ تنخواہ ملتی تھی۔ گھر سے بھی کچھ تھوڑا بہت سہارا تھا۔ لیکن اس کو تو روپیہ
کا نہیں صرف ترقی کا لالچ تھا۔ زندگی کے زریں لمحے جینے کا لطف اور بیوی کی امنگیں
خوشی اور ارمان سب کچھ وہ اس مقصد کے لئے قربان کر رہا تھا۔ اس نے کبھی یہ سوچا ہی
نہیں کہ میں کیا دے کر کیا لے رہا ہوں۔ سونا دے کر ٹھیکرا۔ ہر تی دے کر پتھر۔ زندگی
جینے کے لئے ہے۔ محنت انسان اس لئے کرتا ہے کہ فرصت کے لمحوں سے لطف اندوز
ہو سکے ایسا کام جس سے آرام کی بھی مہلت نہ ملے کس کام کا۔ لیکن جمیل کو ان باتوں

پر غور کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ ثریا کا دل ٹوٹ گیا۔ اس کی امیدیں یاس سے بدل گئیں، امنگیں، وارمان رخصت ہو گئے لیکن جمیل، اسے کچھ احساس ہی نہ تھا۔

ثریا بہت دیر تک کھڑکی کے پاس کھڑی اپنی پانچ سالہ مرقع زندگی کو دیکھتی رہی ہر دفعہ اس خیال سے اس کی ناامیدی ایک گونہ برداشت کے قابل ہو جاتی کہ اچھا اب کے نہیں تو آئندہ سہی۔ لیکن پانچ سال سے یہی ہو رہا تھا۔ ہر مرتبہ اس کی امیدوں کا ملبہ بنا بنا کر توڑ دیا جاتا تھا۔ اب از سر نو اس کے بنانے کی طاقت نہیں تھی۔ آج اس کے دل میں کوئی چیز ہمیشہ کو ٹوٹ چکی تھی۔ جمیل کو کیا معلوم کہ اس کے انکار نے ثریا کی تمام امیدیں خاک میں ملا دیں۔ اس نے ادھر ادھر کی فضول باتیں شروع کیں لیکن جب ثریا کو خاموش دیکھا تو خود بھی خاموش ہو گیا۔" اونہہ ہر سال میں دو چار مرتبہ یہ دورہ انہیں ہوتا ہے خود ہی ٹھیک ہو جائیں گی۔ اب میں کہاں اتنے اہم موقع پر چھٹی لے کر انہیں سیر کراتا پھروں یہ بھی اچھا شوق ہے۔ اور پھر مردوں کو یہ شوق ہوتا ہے۔ عورتوں کو کہیں بھی نہیں سنا" پوجا کی تعطیل کے دس دن ثریا کے لئے بہت کٹھن گزرے اس کے اپنے فلیٹ کے تینوں کمرے ہمیشہ سے زیادہ تنگ اور اپنی گلی ہمیشہ سے زیادہ بے رونق معلوم دیتی تھی۔ آس پاس کے گھروں کے لوگ اکثر تو چلے گئے تھے اور جو تھے ان کے یہاں پوجا کی چہل پہل۔ ثریا کو اپنی تنہائی

اور بھی یاد دلاتی تھی۔ یہ سب بنگالی تھے اور ثریا اور جمیل یو۔پی کے۔ اس لئے
ان سے ان کا زیادہ ربط ضبط نہیں تھا۔ بنگالی عورتیں بہت ملنسار ہوتی ہیں۔ وہ
اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں اکثر ثریا سے باتیں کرنے کی کوشش کرتیں اور جب
ثریا کی بچی چار مہینے کی ہو کر گزر گئی تھی تو انہوں نے اس سے بہت کچھ اظہار
ہمدردی کیا تھا لیکن زبان کی دقت سے ان میں اور اس میں بے تکلفی نہ ہو سکی
ان تاریک گھڑیوں میں بھی جب نسرین اس سے چھن گئی تھی جمیل کو دو دن سے
زیادہ چھٹی لینے کی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد بھی اس کو یہ احساس نہیں
ہوا تھا کہ ثریا کو کہیں لے جائے۔ کم از کم گھر ہی بدل ڈالے جہاں کی ہر ہر چیز ثریا
کو نسرین کی یاد دلاتی تھی۔ ایسے محلے ہی میں اسے لے جاتا جہاں دو چار گھر اسے
ایسے ملتے جن میں وہ آجا سکتی۔ اس دفعہ بھی جمیل حسب معمول اپنی نوکری کے کسی
اہم موقع پر تھا اور یہ تبدیلیاں اس کی پوری توجہ اور انہماک میں دخیل ہوتیں۔ پھر جا
کی چھٹی ختم ہو گئی۔ جمیل دفتر چلے گئے۔ ثریا اسی برآمدے میں آ کھڑی ہوئی اور اس
گلی کو اسی طرح دیکھنے لگی جیسے کہ وہ ہمیشہ دیکھا کرتی تھی۔ آج بازو کے فلیٹ میں اردو
باتیں کرنے کی آواز سے وہ چونک پڑی۔ کئی ہفتے سے وہ خالی تھا۔ آج اس میں
نئے لوگ آرہے تھے ان کا سامان گلی میں اتر رہا تھا۔ یہ لوگ اردو بولنے والے

کوششِ ناتمام

تھے۔ آج پانچ سال بعد اس محلہ میں ایسے لوگ آرہے تھے جن کی بات وہ سمجھ سکتی اور اپنی سمجھا سکتی تھی۔ اسی خوشی سے وہ برآمدہ کی ریلنگ پر جھک کر دوسرے فلیٹ کو جھانکنے لگی۔ ایک سانولی رنگت کی لیکن بہت ہی نمکین شکل خوش وضع ساڑی پہنی ہوئی عورت قلیوں سے سامان رکھوا رہی تھی سپارٹس شرٹ اور سفید پتلون پہنے ایک مرد بھی اس کی مدد کر رہا تھا۔ شکل اور بات کرنے کے لہجہ سے یہ لوگ یو۔پی کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے "ارے بھئی یہاں رکھو۔ اِدھر نہیں اُدھر اس صندوقچہ کو۔ قلی ان کی بات نہ سمجھتے تھے۔ ثریا نے اپنے برآمدے سے جھک کر کہا "دیکھئے میں آکر ان کو سمجھا دوں"۔ نووارد دوں نے جلدی سے وہ دروازہ جو ان کے اور ثریا کے فلیٹ کے درمیان تھا کھولتے ہوئے کہا: "اخاہ! آپ اردو بولتی ہیں بھئی ہم تو پاگل ہوئے جا رہے ہیں۔ یہاں ہماری بات کوئی نہیں سمجھتا"۔ خوش رُو عورت نے ہنستے ہوئے کہا۔

یہ تقریب تھی اس ملاقات کی جس کا ثریا کی زندگی پر اتنا اہم اثر ہونے والا تھا ثریا کو یہ لوگ اور ثریا ان کو اس محلہ میں ایک نعمت ہوگئی۔ اور اس ہم جنسی اور ہم زبانی نے ان میں بہت جلد دوستی پیدا کر دی۔ مسز ریاض عیسائی تھیں یو۔پی کے ایسے خاندان کی جو مسلمان تھے۔ مگر عیسائی ہوگئے تھے۔ لیکن رہنا

آزاد چڑیا

سہنا، بول چال، یہاں تک کہ نام تک مسلمانوں کے تھے۔ ثریا کو ایک گونہ افسوس تو ضرور ہوا۔ کہ یہ لوگ مسلمان نہیں لیکن جب مسز ریاض کی ملنساری اور خوش مزاجی نے جلد یہ افسوس بھی دور کردیا تو دونوں کی یہ کیفیت ہوگئی کہ جہاں اپنے اپنے گھروں کے ضروری کام سے فراغت ہوتی اور یہ اُن کے اور وہ ان کے یہاں نٹنگ کے نمونے دکھائے جارہے ہیں نئے نئے کشیدے کی بیلیں کاڑھی جارہی ہیں۔ غرض ثریا کی تنہا اور بے لطف زندگی میں گویا بہار آگئی۔ ثریا اسکول کی تعلیم یافتہ تھی۔ کچھ یوں ہی سا پردہ تھا۔ بہت جلد ریاض کے سامنے آنے لگی اور اس طرح ان کی بے تکلفی میں کسی طرح کی روک ٹوک باقی نہیں رہی۔ جمیل ثریا کو مشغول دیکھ کر خوش ہوتے۔ کچھ یوں ہی سی کھٹک ثریا کی تنہائی کی تو انکے دل میں تھی اور جس کی وجہ سے وہ آفس سے چھ ساڑھے چھ بجے آجاتے تھے وہ بھی جاتی رہی۔ اور اب وہ آفس سے سات سات آٹھ آٹھ بجے تشریف لانے لگے۔

ریاض دفتر سے چار ساڑھے چار بجے بہت دیر ہوئی تو پانچ بجے آجاتا تھا اور شام کو میاں بیوی ہوا خوری کو چلے جاتے تھے۔ ہر ہفتے سینما جاتے یا فرپو میں چاء پیتے یا اوٹرم گھاٹ کی سیر کو نکل جاتے۔ چورنگی میں گھومتے۔ دکانیں دیکھتے یا پارکس میں سیر کرتے۔ غرض بڑے لطف اور خوشی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ مسز ریاض نے

کوشش ناتمام

ثریا اور جمیل دونوں کو اپنے ساتھ سیر کو لے جانا چاہا۔ جمیل نے تو یہ کہہ کر میں بہت تھکا ہوا آتا ہوں نہیں جا سکتا انکار کر دیا اور کچھ دنوں تک ثریا نے بھی اکیلا جانا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن اپنی بے کیف زندگی کا مسز ریاض کی پر لطف زندگی سے اور جمیل کی بے پروائی کا ریاض کی توجہ سے مقابلہ کر کر کے ثریا کے دل میں بغاوت کے جو جذبات عرصے سے دبے پڑے تھے سلگ اٹھے۔ اس نے سوچنا شروع کیا کہ میں کیوں اپنی زندگی تباہ کر دوں۔ یہ آدمی مردہ دل ہے میں کیوں جیتے جی اس کے ساتھ مردہ بنوں اور اس صورت میں جبکہ اس کو یہ احساس بھی نہیں کہ اس کی لاپرواہی نے مجھے کن کن چیزوں سے محروم کر رکھا ہے۔

ایک نیا فلم آیا ہوا تھا اس کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ مسز ریاض نے ثریا سے بھی چلنے کو کہا تو وہ راضی ہو گئی۔ مسٹر و مسز ریاض ہمیشہ ہر ہفتہ یا تو سنیما جاتے یا فرپو میں کیونکہ ان کی آمدنی جمیل سے بہت کم تھی لیکن ثریا کے جانے کے اعزاز میں اس ہفتہ انہوں نے فرپو اور سنیما دونوں جگہ جانے کا فیصلہ کر لیا اور باقاعدہ انگریزی طریقہ کے مطابق۔ چونکہ ایک لیڈی ان کے ساتھ تھی، ایک جنٹلمین بھی انہوں نے اور بلایا۔ فرپو میں ریاض نے ایسی جگہ میز ریزرو کرائی تھی جہاں سے دریا نظر آتا تھا سب نے مل کر چاء پی۔ ریاض نہایت زندہ دل اور بامذاق آدمی تھے اور

آزاد چڑیا

ان کے دوست حمید بھی ایسے ہی نکلے۔ وہ کلکتہ کے ایک شریف مسلمان
خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس لئے اردو خوب بولتے تھے۔ ثریا کا وقت
بہت اچھا گزرا۔ فلم دیکھ کر وہ رات کے نو بجے واپس آئی۔ جمیل کو اب ایک
گونہ حسد پیدا ہو رہا تھا۔ اس کا اظہار اس نے طنز اور بے التفاتی سے کرنا
شروع کیا۔ ثریا کو ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید جمیل پر اس کا یہ اثر ہو کہ وہ خود
ثریا کی تفریح کا انتظام کرنے لگے۔ لیکن اثر اس کے برعکس ہوا۔ جمیل نے ریاض
پر طنز شروع کیا۔ "اونہہ! ابھی نئے نئے آئے ہیں مزہ معلوم ہوگا ہوا خوری کا۔
نکالے جائیں گے تب۔" لیکن تین مہینے ہو گئے ریاض نکالے نہیں گئے بلکہ
جمیل رپورٹ کر دیئے گئے۔ کرسمس آیا اور کرسمس کے آنے سے پہلے ہی سے
ریاض نے اور مسز ریاض نے چھٹیوں کا پروگرام بنانا شروع کیا۔ کرسمس اور نیا سال
کے ملا کر ۵ دن چھٹی کے ملے تھے۔ اور تین دن اور ریاض نے لے لئے اور ان دونوں
نے ہزاری باغ جانے کی ٹھہرائی۔ ثریا سے بھی چلنے کو کہا لیکن ثریا کو اب تک
اتنی جرأت نہیں ہوئی تھی کہ دوسرے شہر اکیلے چلی جاتی۔ اس نے انکار کیا۔ مسز ریاض
نے کہا کہ وہ جمیل سے بھی چلنے کو کہے۔ ان لوگوں نے ایک دوست کے ساتھ ایک
بہت ہی مختصر سامکان کرایہ پر لیا تھا۔ جمیل اور ثریا بھی اس میں شریک ہو سکتے

کوشش ناتمام

تھے۔ ثریا جمیل کی طرف سے اس قدر مایوس ہو چکی تھی کہ اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ جمیل سے پھر کہیں چلنے کو کہے۔ لیکن اس لالچ میں آکر کہ شاید وہ راضی ہو جائے کیونکہ انتظام کا کوئی بکھیڑا نہیں تھا۔ اس نے جمیل سے ذکر کیا۔ جمیل نے بہت سرسری طور پر انکار کر دیا کہ میں اجنبی لوگوں کے ساتھ ایک مکان میں نہیں رہنا چاہتا۔

ریاض اور مسز ریاض چلے گئے۔ ثریا کو اپنا فلیٹ بہت بے رونق اور خاموش معلوم ہونے لگا۔ ادھر تین مہینے کی چہل پہل نے اسے تفریح اور سیر کا دلدادہ بنا دیا تھا۔ کرسمس کی رات جمیل اور ثریا کی بہت لڑائی ہوئی۔ ثریا کے دل میں بغاوت کا جو مادہ تھا وہ پھوٹ نکلا۔ اس نے جمیل کو اچھی طرح جتا دیا کہ وہ اس قسم کی زندگی سے بیزار تھی جیسی پانچ سال سے اس نے جمیل کے ساتھ بسر کی تھی۔ جب اس کی شادی ہوئی تو اسے یہ توقع نہ تھی کہ اس کا شوہر ایسا بے حس مردہ دل انسان ہوگا کہ اسے آجکل کے طرز معاشرت اور طرز زندگی کا بالکل شوق نہ ہوگا۔ جمیل نے یہ محسوس نہیں کیا۔ ثریا کس خطرناک راستے پر ہے۔ اس کے جذبات کیا صورت اختیار کر رہے ہیں اور اس کا کیا نتیجہ ہونیوالا ہے۔ اس نے ان ساری باتوں کا ذمہ دار مسز ریاض کے تعلقات کو قرار دیا

اور سوچا کہ مکان بدل دینا چاہیئے۔ یہ نہیں سمجھا کہ ثریا کے دل میں جو جذبہ ابھرا ہوا تھا مسز ریاض کی زندگی نے اسکو صرف برانگیختہ کر دیا ہے۔ لیکن اس جذبہ کی ذمہ داری مسز ریاض پر نہیں جمیل پر تھی۔ چند مہینہ اور گزر گئے۔ ایسٹر میں ریاض نہیں جا سکے لیکن پوجا کی چھٹیوں میں انہوں نے دارجلنگ جانے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا اس دفعہ ثریا بھی ان کے ساتھ جانے والی تھی۔ جمیل نے کہا: "ثریا تم نہیں جا سکتیں۔" ثریا نے کہا: "کیوں نہیں؟" "میری ممانعت ہے۔" جمیل نے جواب دیا: "تمہاری ممانعت کی مجھے پرواہ نہیں۔" "تو پھر میرے گھر واپس مت آنا۔" "میں خود ہی نہیں آؤں گی۔ تم بے فکر رہو۔ یہ گھر جو دوزخ اور جیلخانہ سے بدتر ہے اس میں خدا مجھے پھیر نہ لائے میں کبھی نہیں آؤں گی۔" ثریا نے جوش میں آکر کہا جمیل نے اس کو دھمکی سمجھی اور چلا گیا۔ لیکن جب وہ شام کو آیا تو ثریا جا چکی تھی۔ اسے بہت تعجب ہوا اور وہ خاموش رہا کہ دس دن چھٹیوں کے ختم ہو جائیں اور ثریا اب واپس آئے پھر اس کی کسر نکال لے گا۔ اور ساری چھٹیاں اس نے مکان ڈھونڈھنے میں صرف کر دیں۔ اور چھٹی کا ایک دن باقی تھا کہ نئے مکان میں آگیا۔ دارجلنگ کی گاڑی صبح آتی ہے اب تک ثریا کو واپس آجانا تھا۔ ثریا واپس نہیں آئی۔ جمیل نے دفتر کے کپڑے پہننے شروع کئے۔ زینہ سے نیچے اترا۔ اس کے فلیٹ کے دروازے

کوششِ ناتمام

پرڈا کیہ ایک خط چھوڑ گیا تھا۔ لفافہ پر تحریر ثریا کی تھی۔ نہ جانے کیوں جمیل کا دل اس خط کو دیکھ کر دھڑکنے لگا۔ وہ خط لے کر واپس فلیٹ میں آیا۔ ٹوپی اتار کر رکھ دی اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خط چاک کرنا شروع کیا۔ خط بہت طویل تھا ثریا نے لکھا تھا: جمیل! میں اب واپس نہیں آرہی ہوں تمہارے ساتھ زندگی ناممکن ہے بلکہ تمہارے ساتھ جو پانچ سال میں نے گزارے وہ زندگی کے مترادف نہیں زندگی نام ہے سیر کا۔ تفریح زندہ دلی کا۔ ان میں سے کوئی بھی چیز تمہارے ساتھ مجھ کو میسر نہیں آئی تم میں اس کی اہلیت ہی نہیں۔ اس کا احساس ہی نہیں۔ تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا اور پیٹ بھرنے کے لئے روٹی کے سوا اور بھی کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاید پہلے زمانے کی عورتوں کو اس کے سوا اور کسی چیز کی خواہش نہ ہوتی ہوگی۔ نہیں۔ ہوتی تو ضرور ہوگی لیکن ان کو یہ تعلیم دی جاتی تھی کہ یہ خواہش بے جا ہے۔ اور بہر حال شوہر کی خوشنودی میں نجات ہے۔ مجھ کو یہ تعلیم نہیں دی گئی۔ مجھ کو یہ لکھایا پڑھایا گیا ہے کہ عورت بھی مرد کے ساتھ ساتھ زندگی کی دلچسپیوں میں حصہ لینے کی حقدار ہے۔ اس لئے جب مجھ کو وہ چیزیں نہیں ملیں تو میرے دل میں صبر کے بدلے بغاوت کا جذبہ پیدا ہوا۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ تم نے مجھ کو قفس میں رکھا لیکن قفس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اور اس قفس میں باغ کے جھونکے آنے لگے۔ اگلے زمانے میں

آزاد چڑیا

مرد عورتوں کے ساتھ قیدیوں کا سلوک کرتے تھے۔ لیکن کم سے کم ان کو یہ خیال رہتا تھا کہ جیلخانے کی سلاخیں مستحکم رکھیں۔ تم نے مجھے قیدی بنا کر رکھا لیکن قیدی کی جو حفاظت چاہیئے وہ بھی نہ کی۔ میری پرورش آزادی کی ہوا میں ہوئی تھی۔ میں نے حقوق نسواں کی آوازوں میں ہوش سنبھالا تھا۔ اس لئے میرے بال و پر میں اڑنے کی سکت باقی تھی۔ میں قفس کی چڑیا نہ تھی قفس میں کیسے رہ جاتی تم نے اور تم جیسے ہزاروں مردوں نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا۔ تم میں سے اکثر نے نفسیات کالجوں میں پڑھی لیکن نفسیاتی اصول کے مطابق اپنے طرز عمل کو جانچنے کا خیال پیدا نہیں ہوا۔ میری اس روش پر بہت کچھ لعن طعن ہوگی، شاید اخباروں میں مضامین چھپیں علمائے دین فرمائیں گے دیکھا عورت کی تعلیم اور بے پردگی کا نتیجہ۔ لیکن یہ صرف عورت کی تعلیم اور بے پردگی کا نہیں مرد کی جہالت اور تنگ نظری کا ہے کہ اس نے عورت کو پڑھانے کے بعد بھی۔ عورت کو آزاد کرنے کے بعد بھی اس سے غلاموں کا سا سلوک کیا۔ غلامی کوئی برداشت نہیں کر سکتا۔ انفرادی اور اجتماعی طور پر آج لوگ غلامی کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔ پھر عورت اس کلیہ سے کس طرح مستثنٰی ہو سکتی ہے۔ بہرحال اب تو میں جاتی ہوں۔ کہاں؟ یہ مجھے خود معلوم نہیں سر دست فی الحال جیسا بھی ہے۔ تم کو تعجب تو نہیں ہونا چاہیئے یہ ہوگا۔ خلع کی درخواست

کوشش ناتمام

باقاعدہ طور پر تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔ تمہارے غرور کو بے شک سخت دھکا پہنچے گا لیکن میں چھ سال تمہارے ساتھ رہی ہوں۔ تمہاری طبیعت کا مجھے اندازہ ہے تم کو دلی رنج کچھ بھی نہیں ہوگا بلکہ کچھ دن بعد تم خود کو آزاد محسوس کرنے لگو گے اور دفتر کا کام اور افسرِ اعلیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے میں زیادہ انہماک سے کام کر سکو گے اور اس طرح تم ترقی کے ان مدارج پر جلد پہنچ جاؤ گے جو تمہارے لئے سدرۃ المنتہیٰ کا درجہ رکھتے ہیں۔ ثریا۔

کہنے کو تو رمیش بابو عالیہ بیگم کے یہاں کا مینجر تھا لیکن ان کی بیس سالہ خدمت جاں نثاری اور محبت کی وجہ سے گھر بھر انہیں عزیز یا رشتہ دار سے بڑھ کر سمجھتا تھا۔ دونوں بچے انہیں رمیش بھیا کہتے تھے۔ اور ان کے دل میں واقعی ان کی اتنی محبت تھی جتنی کہ ایک بڑے بھائی کے لئے ہونی چاہئے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ رمیش ان لوگوں کے لئے بھائی باپ اور چچا سب کی جگہ تھا۔

جب نصیر الدین صاحب کا انتقال ہوا ہے منوّر اور اختر دونوں بچے آٹھ سال اور چھ سال کے تھے۔ عالیہ بیگم کم عمر ناتجربہ کار اور سب سے زیادہ مشکل تو یہ کہ پردہ دار عورت تھیں۔ زمینداری گرچہ کافی تھی لیکن بڑے نواب مرحوم کے زمانہ میں ہی بے انتہا

کوشش ناتمام

مقروض اور رہن شدہ ہو چکی تھی۔ نصیر الدین باپ کے انتقال کے پانچ سال بعد ہی
چل بسے تھے۔ ان کو اتنی مہلت نہیں ملی تھی کہ زمینداری کا کچھ بندوبست کر سکیں
کوشش انہوں نے بیشک شروع کر دی تھی اور رمیش کو انہوں نے ہی اس لئے
نوکر رکھا تھا۔ اور دو ہی سال میں رمیش نے بہت کچھ زمینداری کی حالت سدھار لی تھی
لیکن برسوں کی بدانتظامی کی تلافی سال دو سال میں تھوڑی ہو سکتی تھی۔ جب نصیر الدین
گزرے ہیں زمینداری سے آمدنی تقریباً مفقود تھی۔ اور قرضہ کا ایک بوجھ سر پر تھا
اگر رمیش نہ ہوتا تو آج اختر اور منور کو سر چھپانے کا ٹھکانہ بھی نہ ہوتا۔ لیکن رمیش نے
اپنی پوری زندگی سارا وقت اور انتظامی قابلیت اس کوشش میں صرف کر دی
کہ ان کی زمینداری کی حالت سدھارے ان کو تعلیم دلائے اور ہر طرح سے ان کی تربیت
کرے۔

رمیش جب نصیر الدین کے ہاں نوکر ہو کر آیا تو وہ اٹھائیس سالہ نوجوان گریجویٹ تھا۔ اس
کے دل میں طرح طرح کے "آئیڈیلز" تھے۔ نوجوانوں کی تعلیم کے متعلق وہ نہایت اعلیٰ
خیالات رکھتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ کسانوں اور گاؤں والوں سے اسے بے حد ہمدردی
تھی۔ اور وہ اپنی زندگی کا ماحصل یہ سمجھتا تھا کہ ان کی حالت درست کرے۔ اسی خیال
کے ماتحت اس نے نصیر الدین کے ہاں کی مینیجری قبول کی تھی۔ کیونکہ اس طرح اس کو

اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کا موقعہ ملتا تھا۔

جب نصیر الدین مر گئے اور اس نے ان کی بیوہ اور بچوں کی بے کسی دیکھی تو ان کی خدمت اس نے اپنی زندگی کا پہلا مقصد قرار دیا اور گاؤں والوں کی حالت سدھارنے کو دوسرا۔ اور ظاہر ہے کہ گاؤں کی حالت درست کرنے میں بھی بچوں ہی کا فائدہ تھا۔

اس نے عالیہ بیگم کو سب سے پہلے اس بات پر راضی کیا کہ وہ اپنے گھر کا خرچ گھٹائیں اور جب تک دوبارہ معقول آمدنی نہ ہونے لگے بہت سادہ اور خاموش زندگی بسر کریں۔ شہر کا بڑا اور نہایت ہی بے ڈھنگا مکان جس کی دیکھ بھال کو کئی نوکروں کی ضرورت تھی اس نے کوشش کر کے سرکاری دفتروں کے لئے کرایہ پر دیدیا اور ایک چھوٹا سا خوشنما مکان اسکول کے قریب کرایہ پر لے لیا۔ بڑے مکان کو کرایہ پر دینے سے اتنی آمدنی ہو گئی کہ اس مختصر مکان کا کرایہ دے کر گھر کا خرچ نکل آتے۔

گاؤں سے اس وقت ایک پیسے کی آمدنی بھی نہیں تھی۔ جو کچھ آتا تھا سود میں چلا جاتا تھا۔ رمیش نے دیکھا کہ اس طرح تو نہ عمر بھر قرض ہی ادا ہوگا اور نہ زمینداری سے کچھ آمدنی ہوگی۔ اس نے عالیہ بیگم کو اس بات پر آمادہ کیا کہ تھوڑا حصہ زمینداری کا اور کچھ زیورات فروخت کر کے اتنا قرضہ چکا دیا جائے کہ زمینداری سے اتنی آمدنی تو ہونے لگے کہ سود کے سوا کچھ اصل قرض بھی ہر ماہ ادا ہو سکے۔ عالیہ بیگم تھیں تو

ناتجربہ کار لیکن نہایت ہی عقلمند اور فہمیدہ عورت۔ انہوں نے دیکھا کہ رمیش کی رائے بہت مناسب تھی۔ اس لئے اس پر کاربند ہو گئیں۔ قرض بے انتہا تھا۔ دو ایک گاؤں اور کچھ زیور کے فروخت سے صرف اتنا ہوا کہ قرضہ ادا کرنے کی گنجائش ہو گئی۔ رمیش نے اب اپنی توجہ باقی زمینداری کے سدھارنے پر کی۔ بہت سی زمینیں بیکار پڑی تھیں ان میں اناج بونا شروع کیا۔ پھلوں کے باغ لگائے۔ گاؤں کی صنعت و حرفت کو ترقی دی۔ گاؤں والوں کو زیادہ مرفع الحال اور خوشحال بنانے کی ترکیبیں سوچیں۔ یہ سب کچھ ایک دن ہی نہیں ہوا۔ کئی برسوں کی مسلسل اور ان تھک کوشش کے بعد کہیں رمیش کی کوششیں بارور ہوئیں اور عالیہ بیگم کی زمینداری بہت جلد ایک مثالی زمینداری ہو گئی۔ قرضہ ادا ہو گیا اور آمدنی اتنی ہونے لگی کہ رمیش نے اس سے جتنے گاؤں بکے تھے ان سے کہیں زیادہ رقبہ اور خرید لیا لکھنؤ میں جس مکان میں عالیہ بیگم کرایہ پر تھیں اس کو بھی خرید لیا پہاڑ پر مکان لئے تا کہ گرمیوں میں بچے ہر سال پہاڑ کر رہ سکیں اور ان کی تعلیم و تربیت کا بندوبست بہت اعلیٰ پیمانہ پر کیا۔

جیسا نوابی خاندانوں میں ہوتا ہے ویسا ہی عالیہ بیگم کے یہاں کا بھی دستور تھا یعنی پڑھنا لکھنا واجبی واجبی اور عورتوں کی تعلیم کا تو سرے سے ذکر ہی نہیں تھا وہاں تو مرد بھی یہ کہہ کر پڑھائے نہیں جاتے تھے کہ ان کو کیا نوکری کرنی ہے اور لڑکیاں

کے پڑھنے کا تو کیا مذکور۔ لیکن رمیش نے منور کو کانونٹ میں داخل کرایا اور اختر کو لڑکوں کے اسکول میں۔ گھر پر گھوڑے کی سواری ہر طرح کے کھیل۔ تیراکی وغیرہ سکھانے کا انتظام کرا دیا۔ منور کے لئے ڈرائینگ، گانا اور باجہ سکھلانے کو ٹیچر رکھے۔ اور خود ان کی تعلیم کی نگرانی بہت توجہ سے کیا کرتا تھا۔

ظاہر ہے کہ ان سب باتوں سے رمیش سے بہت سے لوگ جلنے لگے بلکہ دشمن ہو گئے۔ خاندان کے وہ تمام افراد جن کو امید تھی کہ خوب عالیہ بیگم کو لوٹیں گے اور اپنا گھر بھریں گے۔ رمیش کے جانی دشمن ہو گئے۔ پہلے تو الٹی سیدھی شکایتیں عالیہ بیگم سے شروع کیں۔ لیکن ان کا دل خراب کرنے میں جب کامیابی نہیں ہوئی تو خود ان کے خلاف ہو گئے۔ اور اس بے چاری پاکباز عورت پر طرح طرح کے بہتان لگانے شروع کئے۔ جب اختر کو ٹائیفائڈ ہوا اور اس کی طویل اور نہایت ہی خطرناک علالت کے زمانہ میں عالیہ بیگم اس کے سامنے ہو گئیں تو اعتراض کرنے والوں کو اور بھی باتیں بنانے کا موقعہ ملا۔ لیکن عالیہ بیگم کیا کر سکتی تھیں اختر کی حالت اتنی نازک تھی کہ وہ رمیش کے سوا کسی سے نہ دوا پیتا تھا اور نہ انجکشن کرانا تھا نہ کھانا کھاتا تھا۔ نرسوں کو قریب نہیں آنے دیتا تھا۔ خود ماں کی بھی نہیں سنتا تھا۔ ایک رمیش ہی تھا جس کی باتیں اس کی بیماری

کے عالم میں بھی اختر سنا کرتا تھا۔ کیونکہ رمیش میں بچوں کو بہلانے کا فطری مادہ تھا اور اختر اور منور کے ساتھ تو اس نے ایسا برتاؤ رکھا تھا کہ دونوں بچے اس کی صورت کے عاشق تھے۔ بغیر رمیش بھیا کے نہ وہ سیر کو جاتے تھے نہ سینما جاتے تھے نہ کھانا کھاتے۔ جب رمیش گاؤں کے انتظام کے لئے چلا جاتا تھا تو دونوں بچے کڑھ کڑھ کر اپنے کو بیمار کر لیتے تھے۔ اب اختر بیمار رہا تو نہ عالیہ بیگم ہی اس کو چھوڑ سکتی تھیں اور نہ اختر ہی رمیش کو چھوڑتا تھا۔ اور سچ ہے کہ بغیر رمیش کی خدمت کے اختر کا بچنا تقریباً ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ اختر دو مہینے بیمار رہا۔ اور اس دو مہینے میں رمیش نے دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا۔ جو رشتہ دار رمیش کو چور بدمعاش وغیرہ کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ ان کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ ایک دفعہ اختر کو دیکھنے ہی آجاتے۔ خود اختر کے سگے چچا نے کبھی جھانکا تک نہیں۔ بلکہ اسی انتظار میں تھے کہ اختر کے دشمنوں کا کچھ ایسا ویسا ہو جائے تو زمینداری ہڑپ کرلیں لیکن ظاہرا سب رشتہ داروں کا یہ رویہ تھا کہ یہ نامراد ہندو مینیجر عالیہ بیگم کے یہاں ایسا دخیل ہے کہ ہماری غیرت گوارا نہیں کرتی کہ ہم وہاں آئیں جائیں۔ عالیہ بیگم کا اگرچہ زیادہ آنا جانا نہیں تھا لیکن شدہ شدہ ان کے کانوں تک بھی یہ باتیں پہنچیں اور اسے سنکر ان کو جو کچھ رنج ہوا ہو تھوڑا ہے جس عورت

نے اپنی زندگی اپنے بچوں کی پرورش اور بہبودی کے لیئے وقف کر دی ہو اس کے متعلق اگر یہ کہا جائے تو اس کو رنج کیسے نہ ہوگا۔ لیکن عالیہ بیگم نے رمیش کو علیحدہ نہیں کیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ان کے بچوں کا مفاد اس کے رہنے پر منحصر ہے اور دوسرے اپنی خود غرضی کے علاوہ ان کو رمیش کا بھی خیال تھا۔ رمیش جو اپنی وفاداری اور جاں نثاری سے ان کی اور ان کے بچوں کی بہبودی کے لیئے کام کر رہا تھا جس نے ان کو اور ان کے بچوں کو قرضے اور ترقی کے گڑھے سے نکال کر فارغ البالی اور آرام کی زندگی نصیب کرائی تھی۔ وہ کس طرح سے اب اس سے طوطا چشمی کر سکتی تھیں۔

اس کے علاوہ اب اختر بڑا ہو رہا تھا۔ اس کی طبیعت میں ضد کا مادہ تھا۔ وہ بہت زیادہ جوشیلا اور نا عاقبت اندیش طبیعت کا واقع ہوا تھا۔ خاندانی فضول خرچی اور بے پروائی بھی ایسی ہی تھی لیکن رمیش کی صحبت اور رمیش کی نصیحت اور بہت سے امید تھی کہ اختر کا لاابالی پن جاتا رہے گا اور عقل اور دور اندیشی آجائے گی رمیش اب گاؤں جاتا تو اختر کو بھی ساتھ لے جاتا۔ گاؤں کی حالت سے اور گاؤں والوں سے دلچسپی اس میں پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب اختر اور منور چھوٹے چھوٹے تھے تب بھی وہ سال میں ایک دفعہ انہیں اور عالیہ بیگم کو ان کی زمینداری پہلے جاتا

تھا تاکہ وہ لوگ اپنی رعایا سے اور رعایا ان لوگوں سے بیگانہ نہ ہونے پائے
ایسا خیر خواہ نوکر کسی کو قسمت سے ہی میسّر آتا ہے۔ عالیہ بیگم اس کی جتنی بھی قدر
کرتیں کم تھا۔ رمیش کو ان کے یہاں ایک رشتہ دار بلکہ اس سے بھی زیادہ
کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ ان کے ساتھ کھاتا پیتا تھا۔ شام کو ان میں بیٹھ کر
باتیں ہوتیں سیر کو ساتھ جاتے۔ رمیش کی زندگی ان لوگوں کے ساتھ وابستہ تھی
اس نے شادی بیاہ کچھ نہیں کیا تاکہ ان کی خدمت میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔ عالیہ بیگم
نے کئی دفعہ کہا۔ رمیش بابو آپ شادی کیوں نہیں کرتے ہیں چاہتی ہوں کہ آپ
کی بہو بیاہ لاؤں۔ بچے بالے ہوں لیکن رمیش ہمیشہ یہ جواب دیتا کہ بیگم صاحب
منور اور اختر کے علاوہ اور کسی بچے کی محبت کے لئے میرے دل میں جگہ باقی
نہیں ہیں شادی کر کے کیا کروں گا۔ اور یہ واقعہ تھا کہ رمیش اپنی ساری متاعِ الفت
عالیہ بیگم کے خاندان پر نثار کر چکا تھا اب اور کسی کے لئے اس کے پاس کچھ نہ تھا۔
منور اور اختر کو وہ بے انتہا چاہتا تھا۔ وہ بڑے ہو رہے تھے۔ ان کو بڑھتے
ہنر میں ترقی کرتے دیکھ کر اس کو ایسی خوشی ہوتی تھی جیسے کسی مالی کو اپنے لگائے
ہوئے پودے کو پھولتے پھلتے دیکھ کر ہوتی ہے۔ اب اس کی یہ آرزو تھی کہ منور
کی شادی کسی اچھے لڑکے سے ہو جائے۔ منور اب ۱۹ سال کی ہو چکی تھی۔ اس نے

منجھر

بنارس کالج سے بی۔ اے بہت شان سے پاس کیا۔ ہر قسم کا ہنر سلیقہ اس میں تھا۔ مشرقی اور مغربی تہذیب کا بہترین نمونہ تھی۔ خوبصورت تھی دانشمند تھی غرض ہمہ صفت موصوف اگر کوئی کہلا سکتا تھا تو منور کہلا سکتی تھی۔ لیکن اب تک اس کے لئے کہیں سے خواستگاری نہیں آئی تھی۔ خاندان میں کئی اچھے لڑکے تھے لیکن کہیں سے تحریک نہیں ہوئی تھی۔ جو لوگ منور کے بچپن میں کہا کرتے تھے کہ یہ تو ہماری ہے اب وہ بھی مہر سکوت لگائے بیٹھے تھے۔ اب سب فکروں سے نجات پانے کے بعد عالیہ بیگم کو اس فکر نے گھیرا اور عالیہ بیگم کے برابر بلکہ ان سے زیادہ فکر ہمیش کو تھی۔ اس کی حسین تعلیم یافتہ پیاری منور کیلئے کیوں کہیں سے خواستگاری نہیں آتی تھی۔ اس کے ساتھ کی لڑکیاں بیاہنے لگی تھیں۔ ہر چوتھے پانچویں مہینے منور کسی نہ کسی اسکول کی سہیلی کی شادی میں جاتی اور ہمیش دل مسوس کر رہ جاتا۔ اس نے منور کی تفریح کے لئے اس کو اور اختر کو ولایت لے جانے کی ٹھانی عالیہ بیگم کو بھی آمادہ کیا کہ وہ چلیں اور آٹھ مہینے تک سب نے مل کر یورپ کی سیر کی۔ منور پر اس کا اثر بہت ہی اچھا پڑا۔ اختر نے بھی بہت فائدہ اٹھایا اور عالیہ بیگم بھی بہت محظوظ ہوئیں۔ سال بھر بعد یہ لوگ واپس لکھنؤ لوٹے۔ اختر نے بی۔ اے کا امتحان آتے کے ساتھ دیا اور باوجود سال بھر کی غیر حاضری کے بہت اچھی طرح پاس

کوششِ ناتمام

ہوا۔ اب منور کی عمر اکیس سال کی ہو چکی تھی۔ اختر انیس برس ہی تھا لیکن منور منور کی شادی کا کہیں سے ذکر مذکور نہ تھا۔ اکیس سے بائیس اور بائیس سے تئیس اور تئیس سے چوبیس اس سال منور کو لگ گیا لیکن منور منور بن بیاہی اور جو سب سے زیادہ تعجب خیز بات تھی بے مانگی تھی۔ دو ایک پیغام آئے تھے لیکن ایسے کہ منور کے بالکل ہی شایانِ شان نہیں۔ رمیش عالیہ بیگم اپنے اپنے دلوں میں سمجھ چکے تھے کہ اس کی وجہ کیا ہے لیکن ایک دوسرے سے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے جھجکتے تھے یعنی رمیش کی وجہ سے جو دشمنی عالیہ بیگم سے لوگوں کو ہو گئی تھی اس کی کسر اس طرح نکالی جا رہی تھی لیکن رمیش کا دل یقین نہیں کرتا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کیا سوسائٹی اتنی بھی ظالم اور بے رحم اور ناقدرداں ہو سکتی ہے اس نے وفاداری جاں نثاری اور محبت کی اس کو سوسائٹی نے جو سزا دیا اور جرم کی ایسی سخت سزا رمیش کو دی جا رہی تھی جو کہ برداشت کے باہر تھی۔ اس کے ساتھ کچھ بھی ہوتا وہ برداشت کر لیتا۔ اور کرتا تھا اس کے خاندان والے سارے اس سے متنفر ہو چکے تھے۔ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ اور یہ بھی ایک وجہ تھی جس سے کہ وہ شادی نہ کر سکا تھا لیکن اس نے اس کی پرواہ تک نہیں کی تھی۔ لیکن منور اس کی جان سے زیادہ عزیز منور کو سوسائٹی اس طرح ٹھکرائے وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

یہ فکر رمیش کے سر پر ایسی سوار ہوئی کہ راتوں کی نیند اور دن کی بھوک غائب

ہو گئی۔ وہ چپ چپ رہنے لگا منور اور اختر جن کے ساتھ وہ ہم عمروں کی طرح
مذاق کرتا تھا اس کی اس اداسی پر سخت حیران تھے۔ اور آپس میں کہتے تھے کہ رمیش
بھیا اب بڈھے ہو گئے۔ اب ویسی باتیں نہیں کہتے۔ ان کو کیا معلوم کہ رمیش کے
دل میں کیا آگ لگی ہوئی تھی۔

آخر وہ اس کشمکش کو نہ برداشت کر سکا اور نصیر الدین کے ایک پرانے
دوست سر عنایت علی کے پاس گیا۔ یہ نصیر الدین کے دوستوں میں واحد شخص تھا
جس نے کسی طرح کا تعلق نصیر الدین کی بیوی اور بچوں سے باقی رکھا تھا۔ اگرچہ یہ
تعلق سال میں ایک آدھ دفعہ جا کر خیریت پوچھنے کے سوا اور کچھ نہ تھا لیکن عالیہ
بیگم اس کو بھی غنیمت سمجھتی تھی۔ اور رمیش بھی سر عنایت علی رمیش کو بہت ایماندار
اور نیک آدمی سمجھتے تھے اور برابر اس سے بہت اچھی طرح ملتے تھے۔ رمیش نے
سوچا کہ چل کر ان سے پوچھے کہ اس کے اس وہم کی کچھ اصلیت بھی ہے یا نہیں۔
یعنی کیا منور کی شادی اس لئے نہیں ہو رہی ہے کہ اس کی ہستی منور کے خاندان
کا ایک بدنما داغ سمجھی جاتی ہے۔ اور اگر یہ سچ ہے تو اس کی کیا تلافی ہو سکتی ہے؟

سر عنایت علی نے رمیش کو بہت افسوس کے ساتھ یقین دلایا کہ اس کا
وہم، وہم نہیں واقعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منور جیسی ہمہ صفت موصوف لڑکی کو بر

کوشش ناتمام

نہیں مانا۔ رمیش کی آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔ اس کا کیسے علاج ہو۔ ۸۰ سال کی جاں نثاری کو سوسائٹی نے جرم قرار دیا تھا لیکن اب یہ جرم تو ہو چکا اس کی کیسے تلافی کی جائے۔ عنایت علی نے کہا کہ اگر رمیش اب بھی چلا جائے تو شاید سوسائٹی اس بات کو درگزر کر دے۔ آخر میں فتح چونکہ سوسائٹی کے ہی ہاتھ ہوگی اس لیئے گزشتہ کو وہ فراموش کرنے پر تیار ہو جائے گی۔ سوسائٹی نے رمیش اور مالی بیگم کے تعلقات کو ناجائز سمجھا اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ انہوں نے اس کی پرواہ نہیں کی تو اس نے یہ جتا دیا کہ وہ اس کی مرضی کے خلاف عمل کر کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اب اگر رمیش چلا جائے تو سوسائٹی کی فتح مکمل ہو جائے گی اور شاید اُس کا غصہ فتح کی خوشی میں فرو ہو جائے۔

رمیش سر عنایت علی سے بار بار یہ دریافت کرتا تھا کہ وہ اس کو یقین دلائیں کہ اس کے چلے جانے سے منوّر کی شادی میں کوئی رکاوٹ تو نہیں رہے گی۔ وہ یقین دلانے پر آمادہ نہیں تھے لیکن رمیش ان سے وعدہ لے کر ہی ٹلا۔

گھبرا کر اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ چلا جائیگا۔ کہاں جائے گا اور کیا کرے گا اس کو سوچنے کی اس میں طاقت نہیں تھی۔ اور اس کا دل چھد چھد ہو رہا تھا جبوں رخصت کر اس نے لگایا تھا۔ جن پودوں کو اس نے اپنے خون سے سینچا تھا ان کے سایہ میں

بیٹھنے کی اجازت ظالم سوسائٹی اس کو نہیں دے رہی تھی اب چالیس بیالیس سال کی عمر میں اس کو روٹی کی تلاش میں پھر نکلنا پڑ رہا تھا۔ کیونکہ اس اٹھارہ سال میں اس نے اپنے لئے کچھ نہیں کیا تھا۔ جو سو روپیہ اس کو تنخواہ کے ملتے تھے اس کے سوا ایک پائی حرام سمجھا اس کا بھی بیشتر حصہ اختر او رمنور کو تحفہ دینے میں صرف ہو جاتا تھا۔ عالیہ بیگم خفا ہوتیں منع کرتیں تنخواہ بڑھانا چاہتیں لیکن رمیش راضی نہ ہوتا۔ اور عالیہ بیگم بھی یہ سمجھ کر کہ محبت کا بدلہ روپیہ نہیں ہے، جاں نثاری کا بدلہ ترقی دے کر نہیں ہو سکتا۔ چپ ہو گئیں۔ اس کا بدلہ تو عزت احسانمندی اور محبت ہی ہو سکتی ہے اور یہ خاندان اسی طرح رمیش کے احسان کا بدلہ اتار رہا تھا۔ اور ہمیشہ اتارتا رہتا لیکن سوسائٹی کا ظالم ہاتھ درمیان میں آکر انہیں جدا کر رہا تھا۔

اس نے دل کڑا کر کے عالیہ بیگم سے کہا کہ وہ اب رخصت چاہتا ہے۔

عالیہ بیگم کو ایسا معلوم ہوا کہ پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ رمیش ہی کے سہارے انہوں نے اتنا کچھ کیا تھا۔ اب بغیر رمیش کے وہ کیسے رہ سکتی تھیں۔ اور منور کی شادی تو اب تک نہیں ہوئی تھی۔ رمیش انہیں کس طرح کہتا کہ منور کی شادی ہی کی خاطر وہ جا رہا ہے۔ نہیں وہ ایثار ہی کیا جو جتا دیا جائے۔ اس نے بہزار دقت ان سے اجازت لے لی۔ شاید انہوں نے اس کے حقیقی مقصد کو سمجھ لیا ہو اور چونکہ بچوں

کی ہمدردی ان دونوں کا مقصدِ زندگی تھا کہ رمیش کے رہنے پر اصرار نہ کیا ہو۔ بہرحال ان دونوں میں سے کسی نے بھی اپنے دل کا حال دوسرے سے نہ کہا۔

بچوں نے جب سنا کہ رمیش جا رہے ہیں تو ان کو بے حد قلق ہوا۔ وہ بھڑ کی طرح رمیش کے پیچھے پڑ گئے۔ منو نے تو رو رو کر برا حال کر لیا۔ رمیش کے دل پر ان کا اصرار چھریاں چلاتا تھا۔ اس نے انہیں سمجھایا کہ دیکھو میں بیس سال کے قریب ایک ہی جگہ پڑا رہا ہوں مجھے بھی کچھ دنیا دیکھنے کی، زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے کی ہوس ہے قبل اس کے کہ بالکل ہی بوڑھا ہو جاؤں یہ ہوس پوری کر لینے دو۔ لیکن بچے یہ نہیں سمجھتے تھے کہ وہ اپنا پتہ نشان کیوں نہیں انہیں دیتا رمیش جانتا تھا کہ اگر اس کا تعلق کچھ بھی اس خاندان سے قائم رہا تو جس مقصد کے لئے وہ جا رہا ہے وہ پورا نہیں ہوگا۔ اس نے کہا "نہیں منور، اختر میں تمہیں پتہ نہیں دوں گا میں بالکل ہی آزاد رہنا چاہتا ہوں۔ اور پھر اچانک ایک روز واپس آ جاؤں گا۔" غرض بہ ہزار دقت وہ عالیہ بیگم کے گھر سے چلا گیا۔ اس کے جانے کا ہر ایک کو بے حد غم تھا۔ اختر اور منور کو سینما جانے اور سیر کرنے کا مزہ نہیں آتا تھا۔ عالیہ بیگم کو ہر ہر موقع پر رمیش کی صلاح مشورہ اور ہمدردی کی ضرورت ہوتی تھی۔ لیکن مجبوری تھی کیا کرتے۔ شدہ شدہ ان کو رمیش کے بغیر رہنے کی

عادت ہونے لگی۔ اور تھوڑے ہی دن بعد گھر میں دلچسپی کے دوسرے سامان پیدا ہونے لگے جس نے رمیش کی یاد کو بھلا یا تو نہیں کیونکہ عالیہ بیگم منور اور اختر احسان فراموش نہ تھے لیکن اس کی جدائی اتنی تکلیف دہ نہ رہی۔

رمیش کے جانے کو سات ایک مہینے ہو گئے تھے کہ عنایت علی عالیہ بیگم سے ملنے آئے اور منور کا پیغام لیتے آئے۔ لڑکا آکسفورڈ کا گریجویٹ، بیرسٹر اور بہت اچھے خاندان کا تھا۔ عالیہ بیگم نے فوراً منظور کر لیا۔ اختر کی نسبت بھی ٹھہر گئی۔ اور دونوں کی شادی تین مہینے بعد قرار پائی۔ عالیہ بیگم نے بڑی دھوم دھام سے شادی کی تیاریاں شروع کیں، کام کے دوران میں اکثر ان کو رمیش کی یاد آجاتی تھی اور آنکھیں آب گوں ہو جاتیں۔ منور بھی دل ہی دل میں اور اختر اکثر رمیش کو یاد کرتا تھا۔ ان کی خوشی میں یہی ایک کانٹا تھا۔

شادی کا دن آگیا۔ عالیہ بیگم شادی کے لئے اپنی بڑی کوٹھی میں واپس چلی گئی تھیں۔ وہ عالیشان محل مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سوسائٹی اپنے عفو کا ثبوت دینے کو جمع ہوئی تھی۔ ہر طرف روشنی تھی۔ باجوں کی آواز سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ برات آگئی نکاح ہونے لگا۔ منور کا ہونے والا شوہر اور اختر دو نوں دولہا بنے مسند پر بیٹھے تھے۔ کمرے کے دروازوں پر آدمی

کوشش ناتمام

دولہے والے پہلے پڑے تھے۔ ایک جھلک دولہا کو دیکھنے کے لئے۔ سارے نوکر چاکر محلہ والے سب ہی تھے۔ ان سب کے پیچھے ایک دبلا پتلا لمزور سا آدمی معمولی لباس پہنے کالی عینک لگائے ہوئے تھا۔ جو دولہا کو ایک نظر دیکھنے کے لئے بہت بیقرار تھا۔ اور لوگوں کو ہٹا ہٹا کر آگے بڑھنا چاہ رہا تھا۔ لیکن کہنیوں کے دھکے اس کو پھر پیچھے کر دیتے تھے۔ ایک آدمی نے ڈانٹ کر کہا: "ارے اوروں کو بھی تو دیکھنے دو۔ تم تو سر ہی پہ چڑھے آتے ہو۔ تم ہو کون آخر کہ تم کو دولہا کو دیکھنے کا اتنا شوق ہے۔"

وہ آدمی کیا بتاتا کون تھا۔ وہ رمیش تھا۔ عالیہ بیگم کا وفادار منیجر جس کی محنت جس کی وفاداری جس کی کوشش سے آج عالیہ بیگم کو یہ دن دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ اور جو منور کے شوہر کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے یوں دھکے کھا رہا تھا۔ اور باوجودیکہ اس کا دل تڑپ رہا تھا۔ کہ ایک نظر منور کو دلہن بنے ہوئے دیکھ لے۔ ویسے ہی ناکام چلا گیا۔

مجرم

مجھے قصہ لکھنے کا شوق تھا لیکن پلاٹ کوئی نہیں سوجھتا تھا۔ بہتیری دماغ سوزی کر دی۔ پر بیکار۔ ایک دوست نے کہا کہ کورٹ میں جا کر مقدمے سنا کرو۔ بہت سے پلاٹ ملیں گے۔ مجھ کو تو پلاٹ کی جستجو نے بے چین کر رکھا تھا۔ فوراً ان کی اس صلاح کو مان لیا اور کورٹ میں جانے لگا۔ پہلے دو ایک دن تو کوئی خاص مقدمہ پیش نہیں ہوا۔ لیکن تیسرے دن ایک ایسا مقدمہ آیا قتل کا۔ مجرم ایک ۲۷-۲۸ سال کی عورت تھی جس پہ شوہر کے قتل کا شبہ تھا۔ یہ عورت جس وقت مجرم کے کٹہرے میں آ کر کھڑی ہوتی اس کے چہرے پر ایسی یاس اور حسرت اور ناامیدی تھی کہ میں نے آج تک کسی انسانی چہرے پہ نہیں دیکھی۔ اس نے جج کے سوالات کا جواب اس

کوششِ ناتمام

طور سے دیا جیسے اس کو اس کی مطلق پروا نہیں تھی کہ جو وہ کہہ رہی تھی اس کا اثر جج پر کیا ہوگا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی کوئی نہیں سنے گا اس لئے وہ اپنی سنانا ہی نہیں چاہتی تھی۔

میرے دل پہ اس کے رویّے کا کچھ ایسا اثر پڑا کہ کیا بتاؤں۔ مجھ کو یقین تھا کہ اس کا معاملہ کچھ اور ہے۔ یہ نہیں جو کہ کورٹ میں پیش کیا گیا ہے۔ کورٹ کا قصّہ تو تھا کہ یہ عورت ایک معمولی تاجر کی لڑکی تھی۔ اس کی شادی اس کے گاؤں کے ایک بہت ہی معزز خاندان کے ایک آدمی سے ہوئی تھی جو اس سے عمر میں بہت بڑا تھا۔ اور جو اپنے مکان کی تیسری منزل کے نیچے مرا ہوا پڑا ملا۔ شک تھا کہ عورت نے اس کو تیسری منزل سے دھکیل کر مار ڈالا۔ کیونکہ اس کے اچانک آجانے سے اس کی بدمعاشی اس پر ظاہر ہو گئی تھی۔ کورٹ کی ہمدردی ظاہرا طور پر مقتول کے ساتھ تھی۔

نچلے طبقہ کی کمین عورت کا اعلیٰ خاندان میں شادی کرنا ایک ایسا جرم ہے جس کو اعلیٰ طبقہ والے کبھی معاف نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ عورت بدمعاش اور خونی تھی۔ اس لئے کسی کے دل میں اس کی کیا ہمدردی ہو سکتی تھی۔ اسی روز شام کو میری بہن نے اخبار میں اس مقدمہ کا حال پڑھ کر کہا کمبخت کمین عورتیں شریف

خاندان کے لڑکوں کو پھانس کر تباہ کرتی ہیں۔ پھانسی! ایسی عورتوں کی بوٹیاں
تک چیل کووں کو کھلا دینی چاہئیں۔

لیکن میرا دل اس فیصلہ کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ عورت کی حسرت زدہ
صورت رہ رہ کر میری نظروں کے سامنے آتی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اس کی زبان
سے تو سنوں کہ قصہ کیا ہے بڑی مشکل سے میں نے یہ اجازت حاصل کی کہ مجھ کو اس
عورت سے جیل میں مل کر بات کرنے کا موقعہ دیا جائے۔

جب میں اس کی کوٹھڑی میں گیا تو اس کی پشت میری طرف تھی۔ میری موجودگی
کا اس کو احساس تک نہیں ہوا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے اس کی توجہ اپنی طرف
منعطف کرائی۔ اس نے ناکامی کے غم سے تھکی ہوئی آنکھیں میری طرف اٹھا کر
مجھ سے پوچھا کہ میں اس کی کوٹھڑی میں کیوں آیا۔

میں نے کہا میں نے کورٹ میں آپ کو دیکھا تھا میں سمجھتا ہوں آپ بے قصور
ہیں۔ آپ اپنا قصہ مجھ کو سنائیں میں کوشش کرونگا کہ آپ کی بے قصوری ثابت
کر کے آپ کو چھڑا دوں۔

اس عورت کو بڑی مشکل سے میرا یقین آیا۔ اور وہ تب بھی سمجھ نہیں سکی کہ
میں کیوں اس کے معاملہ میں دخل دینا چاہتا ہوں۔ اور مجھ کو کس طرح اس سے ہمدردی

کوشش ناتمام

ہو سکتی ہے اس کے تجربہ میں آج تک یہ باتیں نہیں آئی تھیں۔

اس نے جو قصہ مجھ کو سنایا وہ یہ تھا۔

اس کی عمر اس وقت ۲۰ سال کی تھی۔ اس کی شادی گیارہ سال کی عمر میں ایک ۴۲ سال کے آدمی سے اس کے باپ نے اس لئے کر دی تھی کہ وہ ایک اعلیٰ خاندان کا شخص تھا۔ اگرچہ وہ اپنی بد چلنی اور آوارگی کی وجہ سے اپنی تمام جائداد برباد کر چکا تھا اور اس کے خاندان والے اس سے ملتے تک نہ تھے۔ لیکن اپنے کے باپ کے لئے وہ ایک نعمت غیر مترقبہ تھا۔ اس نے روپیہ پیدا کیا تھا اور وہ مرفہ الحال تھا۔ اس کے مکانات تھے، دکانیں تھیں۔ گھر میں نوکر چاکر تھے لیکن اس کے دل میں شریف کہلانے کی تمنّا تھی۔ وہ حسرت سے ان لوگوں کی طرف دیکھتا تھا جو کہ پشتوں کے امیر تھے بلکہ جو کہ اس سے بدرجہا غریب تھے لیکن جن کی عزّت ہر جگہ ہوتی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ شرفا میں اس کا بھی شمار ہو۔ اس کے بیٹے بیٹی بھی ان میں بیاہے جائیں۔ وہ بھی ان میں اٹھ بیٹھ سکے۔ لیکن باوجود اس کی دولت کے یہ بات اس کو میسر نہ تھی۔ اس نے بہت کوشش کی کہ اس کی پانچ لڑکیوں میں سے کسی کا بھی رشتہ ان پرانے شرفا میں ہو جائے۔ اس نے بھاری جہیز جائداد اور داماد کی تعلیم کا ذمہ لینا چاہا لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ کئی اور آدمی جنہوں نے اس کے ساتھ ہی روپیہ پیدا کیا تھا،

اونچے گھروں میں رشتہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن مولا بخش کو یہ بات نصیب نہیں ہوئی۔ چونکہ کامیابی اس کے پاس دیر سے آئی تھی۔ اس میں کینچلی بدلنے کا مادہ باقی نہیں رہا تھا۔ وہ باوجود کوشش کے اب تک شین قاف صحیح نہیں بول سکتا تھا۔ اچھے کپڑے پہننے سے اس کا دل کڑھتا تھا۔ پان کھا کر تھوک دیتا تھا۔ غرض اس کی دولت اس بات کو چھپانے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی کہ وہ ایک ان پڑھ جاہل آدمی تھا۔

لیکن اس کے دل سے شریف کہلانے کی آرزو مٹتی نہیں تھی۔ اس نے شریف گھرانوں میں لڑکیوں کے رشتے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوا۔ وہ اسی جیسے نئے بنے ہوئے امیروں بلکہ بالکل ہی غریب گھروں میں بیاہی گئیں۔ ان کے شوہروں کو اس نے بہتیرا چاہا کہ پڑھائے لکھائے مگر انہوں نے کاروبار کرنے کو زیادہ پسند کیا۔ اس میں بھی ناامیدی ہوئی۔ جب وہ قریب قریب بالکل ناامید ہو چکا تو نصیر احمد کا پیام امینہ کے لئے آیا۔

نصیر احمد گاؤں کے سب سے معزز خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ نواب ظہیر الدولہ رتن پور کے سب سے بڑے تعلقدار تھے۔ نصیر ان کا پوتہ تھا۔ ماں کی طرف سے بھی اس نے کافی جائداد پائی تھی۔ لیکن سب کچھ پھونک چکا تھا۔ چالیس لاکھ کی جائداد اس نے سال بھر میں تباہ کر دی تھی۔ نابالغ بہن کا حصہ تک صاف کر گیا تھا۔ خاندان والے اس کی صورت سے

کوششِ ناتمام

بیزار تھے جس زندگی پر اس نے سب کچھ قربان کر دیا تھا وہ اس کو چھوڑ کر جا چکی تھی۔ غرض اس کا قصہ وہی تھا جو بگڑے ہوئے امیروں کا ہوتا ہے۔ مولا بخش کی یہ خواہش کہ پرانے امیروں میں رشتہ کروں سارے گاؤں کو معلوم تھی۔ نصیر احمد ہر طرف سے ناامید ہو گئے تو ان کو سوجھا کہ لاؤ اس گانٹھ کے پورے اور عقل کے اندھے کو الّو بناؤ۔ اس نے امینہ کے لئے اپنا پیام دلوایا۔ امینہ ۱۱ برس کی بچی۔ نصیر احمد ۴۲ سال کا ادھیڑ مریض۔ آوارہ اور بدچلن

لیکن مولا بخش کو تو شریف خاندان میں رشتہ کرنے کے شوق نے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اسے بھلے اور برے کی سمجھ کہاں تھی۔ اس نے آنکھ بند کر کے رشتہ منظور کر لیا۔ اور بڑی دھوم دھام سے شادی کی تیاری شروع کر دی۔

اس کی مدت کی تمنا بر آئی تھی۔ اس نے دل کھول کر خرچ کیا۔ وہ دکھانا چاہتا تھا کہ اسے امیروں کے طریقے سے ناواقفیت نہیں۔ برات بڑی دھوم دھام سے منگائی اور جگہ جگہ ٹھہر ٹھہر کر اس نے اعلان کیا کہ نواب ظہیر الدولہ کے پوتے سے اس کی لڑکی کی شادی ہو رہی ہے۔

مولا بخش کی دیرینہ تمنا پوری ہو گئی اور امینہ کی زندگی کا پر الم قصہ شروع ہوا۔ اس وقت تو امینہ صرف گیارہ برس کی تھی۔ اس نے بھی نہیں جانا کہ کیا ہوا۔

ہاں اس کو اتنی نا امیدی تو اس وقت بھی ہوئی کہ اس کے شوہر نے اس سے دو باتیں بھی سیدھی طرح نہیں کیں۔ لیکن جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی اس نے محسوس کرنا شروع کیا کہ اس کی قسمت پھوڑ دی گئی ہے۔

تیرہ چودہ۔ پندرہ۔ سولہ برس کی عمر چڑھتی جوانی جن کے متعلق شعرا کا قول ہے کہ رنگین خوابوں کا زمانہ ہوتا ہے۔ لیکن امینہ خواب بھی نہیں دیکھ سکتی کیونکہ اس کے خواب بھی چھین لئے گئے تھے۔ جن لڑکیوں کی شادی سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں ہوتی ہے وہ چند سال کم از کم خواب کی دنیا میں تو رہ لیتی ہیں۔ ان کو شوہر خواہ کیسا ہی برا ملے مگر وہ کچھ دن تو اپنی تخیل کی دنیا میں اچھی طرح گزار لیتی ہیں لیکن امینہ کو یہ بھی نصیب نہ ہوا۔ اس نے جوانی کی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے ہی قید و بند اور مصیبت و کلفت کا منہ دیکھا۔ اسے شیریں خواب کی اجازت بھی نہیں ملی

مولا بخش کو بھی اپنی دیرینہ تمنا پورا کرنے کے بعد کوئی خوشی نصیب نہیں ہوئی۔ شادی ہوتے ہی نصیر احمد نے اس پر حکم جانا شروع کیا۔ اس کے رہنے سہنے کا طریقہ نوکر چاکر سب نصیر احمد کے حکم سے بدل دیئے گئے۔ لیکن نصیر احمد پھر بھی سے خاطر میں نہیں لائے۔ نصیر احمد کے کل اخراجات اور بل بے چارے مولا بخش کو

کوشش ناتمام

ادا کرنے پڑتے تھے۔ اس نے عمر بھر میں اتنا خرچ نہیں کیا تھا جتنا نصیر احمد ایک مہینے میں کرتا تھا۔ اس نے شروع شروع تو بڑی خندہ پیشانی سے سب کچھ برداشت کیا لیکن اس کے دوسرے دامادوں کو نصیر احمد کا یہ رویہ سخت برا معلوم ہوتا تھا۔ اور انہوں نے اپنی اپنی بیویوں سے اس کی شکایت کی۔ بیویوں نے بےچاری امینہ پر طعنہ زنی شروع کی۔ سارے گھر میں امینہ مجرم اور ذلیل متصور ہونے لگی۔ نصیر احمد کی تمام حرکتوں کی ذمہ دار۔ شوہر کے کرتوتوں کی ندامت کے مارے وہ گھر بھر کی ٹہل کرتی۔ اور بنے اموں کی لونڈی بن کر ہر ایک کی خدمت کر لگی لیکن نصیر کی زیادتیاں اس کی خدمت گزاری سے کہاں ڈھک سکتی تھیں۔ دن بدن وہ بد سے بدتر ہوتا جاتا تھا۔ اور مولا بخش نے ذرا بھی مزاحمت کی تو طلاق کی دھمکی دیتا تھا۔ مولا بخش نے عمر بھر کی کوشش میں اعلیٰ خاندان میں رشتہ کیا تھا بھلا وہ کیسے اس رشتے کو ٹوٹتا دیکھنا گوارا کر سکتا تھا۔

کئی سال اسی طرح گزر گئے۔ امینہ بچے سے جوان ہو گئی لیکن نصیر کے رویہ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بھلا شاہد بازاری کی آنکھیں بیچاری امینہ میں کیا دیکھتیں وہ نصیر کی بیوی تھی لیکن صرف نام کو۔ نہ تو اسے گھر نصیب تھا نہ بچے، شادی شدہ عورت کی زندگی کا جو سنگھار تھا اس سے وہ محروم تھی۔ اس کی بہنوں کی گود بچوں سے بھری تھی۔

لیکن اس کو یہ دولت نصیب نہ تھی۔

اس کی عمر بائیس سال کی تھی کہ مولا بخش نے انتقال کیا۔ جائداد کی تقسیم پر بہت سخت جھگڑا ہوا۔ دوسری بہنوں کا کہنا تھا کہ نصیر احمد اپنے حق سے بہت زیادہ اڑا چکا ہے لیکن چونکہ قانوناً وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے امینہ کو بالکل یوں کہئے کہ نصیر احمد کے برابر کا حصہ ملا۔

اکیلے گھر میں نصیر احمد کی زیادتیاں اور بے پروائیاں اور بھی بڑھ گئیں اس کی طبیعت میں اب ایک نئی تبدیلی ہوئی۔ وہ بے حد بخیل ہو گیا تھا۔ اب چونکہ عمر کی زیادتی کی وجہ سے اس پر روپیہ اڑانے کے وہ ذرائع بند تھے اس لئے وہ روپیہ بالکل خرچ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اور روپیہ کے اس لالچ سے وہ اپنے ایک چچا کو ساتھ رکھنے کے لئے لے آیا تھا۔ یہ چچا بھی نصیر کی ہی طرح تھے اور سب کچھ تباہ و برباد کر کے شراب کی کثرت سے صحت بھی کھو چکے تھے لیکن کچھ جائداد باقی تھی۔ اور نوابی شان بہت کچھ موجود تھی اب نصیر کے دوسرے رشتہ دار بھی آنے جانے لگے۔ اور ان کا امینہ کے ساتھ حقارت آمیز برتاؤ امینہ کے زخموں پر نمک پاشی کرتا۔ نصیر کی بہنیں وغیرہ امینہ کے منہ پر بے چارے مولا بخش کو گالیاں دیتیں جس نے ان کے جیسے اعلیٰ خاندان میں رشتہ کرنے

کی جرأت کی۔ امینہ کا خون کھول کر رہ جاتا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ ان عورتوں کو منہ توڑ جواب دے۔ لیکن اس کی کیا مجال تھی کہ ایسی جرأت کرے۔ ایک دو دفعہ اس نے دبی زبان سے کہا بھی تھا لیکن ایک کی دس کے آگے کیا چلتی۔ اور کچھ نہیں تو کم ذات ہونے کے الزام کا اس کے پاس کیا جواب تھا۔ وہ واقعی کمین تھی۔ اس کی بدقسمتی کہ شریفوں سے اس کا پالا پڑا تھا۔ کاش کہ عمر بھر وہ کمینوں میں ہی رہتی۔ اس کے کمینہ پن پر پردہ پڑا رہتا۔

زندگی کے دن کٹتے جا رہے تھے۔ ان سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ سال آتا تھا اور نکل جاتا تھا۔ نجات کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اور نہ اس کے پیدا ہونے کی امید تھی۔ زندگی کی بہار کے دن ختم ہو رہے تھے۔ اور بہار میں بھی زندگی خزاں آلودہ تھی۔ زندگی کی خوشی، جینے کا لطف امینہ کو یہ باتیں کبھی نصیب نہیں ہوئی تھیں۔ اور نہ ہونے کی امید تھی۔ اسی طرح زندگی گزر جائے گی اور ختم ہو جائے گی۔ اور اگر نصیر اس کے سامنے بھی مرا تو اس کی زندگی کے جلے ہوئے کوئلوں میں پھر سے جان پیدا ہونی ناممکن تھی۔ اس صورت میں اگر وہ نصیر کا خون کرتی تو بھی انصاف کی رو سے تو وہ مجرم نہیں بن سکتی تھی لیکن اس نے پھر بھی یہ جرم نہیں کیا۔ وہ بالکل بے قصور تھی۔ وہ جرم جس کی

پاداشن اس کو اٹھانا پڑ رہی تھی اس کے کہنے کی خوشی اسے نصیب نہیں ہوئی تھی کیونکہ اگر اس نے نصیر کو مارڈالا ہوتا تو ضرور انتقام کی جو آگ اس کے دل میں تھی وہ بجھ جاتی۔ اس کے دل کی بھڑاس نکل جاتی لیکن اس نے نصیر کو مارا نہیں تھا

گرمی کے موسم میں شام کے وقت وہ کبھی کبھی چھت پر چلی جاتی تھی نصیر نے ایک دن اس کو چھت پر دیکھ لیا تھا اور اس نے سختی سے چھت پر جانے کی ممانعت کی تھی۔ امینہ کے دل میں نصیر کی کسی بات کی وقعت نہیں رہی تھی نصیر کی رضامندی حاصل کرنے کی آرزو برسوں ہوئے اس کے دل سے نکل چکی تھی۔ احساسات کے مردہ ہو جانے کی نشانی ہے کہ پرواہ باقی نہ رہے۔ امینہ کے احساسات مدت ہوئے مردہ ہو چکے تھے نصیر کے چیخنے چلانے کی اس کو پرواہ نہ رہی تھی۔ وہ صبح اٹھتی تھی۔ گھر بھر میں جھاڑو دیتی۔ کھانا پکاتی۔ برتن صاف کرتی بوڑھے چچا کو نہلاتی۔ کھلاتی لیکن یہ سب کام مشین کی طرح کرتی تھی اس میں کسی قسم کے جذبہ کا دخل نہیں تھا۔ اور نصیر کی نصیحت اس میں کوئی فرق نہیں ڈال سکتی تھی۔

ہاں تو وہ باوجود نصیر کے منع کرنے کے جب اس کا دل چاہتا چھت پر چلی جاتی۔ شام کی خنک ہواؤں میں آسمان کے نیچے اس کو ایک گونہ سکون میسر ہوتا تھا۔

کوشش ناتمام

اس کے بیقرار جذبات کچھ منٹوں کے لیے تھم جاتے تھے۔ ۔ وہ خواب ۔ جو پیدا ہونے سے پہلے مر چکے تھے ان کی یاد اسے ٹھنڈی ہوا میں آجاتی تھی۔

لیکن نصیر کے دل میں کچھ اور ہی شک ہو رہا تھا۔ اس نے کبھی شوہر کے فرائض ادا نہیں کئے لیکن شوہر کے حقوق کے تحفظ کا اس کو ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ اپنے شک کی آگ اس کی پھوپھی کے یہ کہنے سے اور بھی بھڑک اٹھی تھی کہ میاں نصیر کمینے خاندان میں شادی کر کے خاندان کی ناک تو کٹوائی اب کم سے کم اس عورت کو ہمیں اور ذلیل کرنے سے تو روکو۔ نصیر نے اس کی تشریح چاہی تو پھوپھی نے کہا کہ محلے میں جو آدمی رہتا ہے اس سے باتیں کرتے امینہ کو دیکھا گیا ہے اور شک ہے کہ صرف باتوں ہی پر اکتفا نہیں ہے۔

نصیر یہ سن کر آگ بگولا ہو گیا۔ پھوپھی کے گھر سے لوٹا۔ امینہ چھت پر تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے آتے کے ساتھ ہی اسے گالیاں دینی شروع کیں۔ اور کہا کہ بتائے کہ وہ کیا کر رہی تھی۔ امینہ اس کے غصے کی عادی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

آج نصیر پر بھوت سوار تھا۔ اس نے بال پکڑ کر امینہ کو سیڑھی پر سے کھینچنا شروع کیا۔ اس کا قدم پھسلا اور وہ قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے آپڑا۔ امینہ نے دیکھا تو اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔

مجرم

امینہ سیڑھیوں پر مبہوت کھڑی تھی کہ محلے والے گھر میں گھس آئے۔ بغیر کچھ پوچھے گچھے اس کو مجرم قرار دے دیا۔ اس لئے کہ وہ جوان تھی کم ذات تھی مظلوم تھی۔ اس لئے اس کا ایسا کرنا فطرتی بات تھی۔ مگر اس نے یہ نہیں کیا مگر یہ کوئی ماننے کو تیار نہیں تھا۔

امینہ نے ٹھہر ٹھہر کر اپنا قصہ کہا۔ وہ پڑھی لکھی عورت نہیں تھی۔ وہ اپنے جذبات کا اعادہ بڑی مشکل سے کرتی تھی۔ لیکن اس کی حسرت سے بھری، دکھ سے بھری یاس و ناکامی سے بھری آنکھیں اس کی زندگی کی ناکامی اور المناکی کی ترجمان تھیں اس نے کبھی خوشی کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ سماج نے ہمیشہ اس پر ظلم ہی کیا تھا۔ اس لئے وہ اب سماج کے اس تازہ ظلم پر متعجب نہ تھی اور نہ شاکی۔ لیکن جب وہ میرے اس قصے کے سننے کے بعد قابل بیرسٹروں کی مدلل جرح کے بعد وہ رہا کر دی گئی تو اس کو تعجب ہوا۔ وہ جیلخانے سے بھاری بھاری قدم اٹھاتی ہوئی بغیر ذرا سی بھی خوشی کا اظہار کئے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

نصیر مر گیا۔ مگر سولہ سال ظلم کر کے امینہ کی آرزوں تمناؤں اور خواہشوں کو مردہ کر دینے کے بعد۔ بعض وقت میں سوچتا ہوں کہ امینہ کو پھانسی سے بچا کر میں نے اس کے ساتھ بھلائی کی یا برائی۔ جب زندگی کی آرزو۔ بچنے کی تمنا۔ دنیا کا شوق۔

نوشتۂ ناتمام

باقی نہ رہے تو پھر مرجانا ہی بہتر ہے۔ امید زندہ ہے لیکن دل میں صرف ایک تمنا لئے ہوئے۔ کاہے کی تمنا؟ موت کی تمنا۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

پاگل

صبح کافی اور پھلوں کا بریکفاسٹ۔ گیارہ بجے اوٹین کی پیالی جس کے درمیان
اخباروں کا مطالعہ۔ ایک بجے مختصر سا لنچ اور پھر آرام، شام کو چائے اور باغ میں
یا کسی پارک میں دو گھنٹے چہل قدمی پھر واپسی اخباروں پر چھچلتی ہوئی نظر۔ رات کا
کھانا پھر وہی اخبار بینی اور پھر آرام۔ یہ اب مسٹر ریاض الدین کبھی کے نہایت
نامی اور کامیاب بیرسٹر کی زندگی تھی۔ وہ آدمی جسے دن کے چوبیس گھنٹے اپنی مصروفیات
کے لحاظ سے تھوڑے سے تھے اس کے لئے اب صبح سے شام اور شام سے صبح کرنا
جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ ان کی عمر گرچہ ستر سال کی تھی لیکن دماغ اب
بھی اتنا ہی بیدار تھا۔ واقعات کو سمجھنے اور ان کی تہ کو پہنچ جانے کی قابلیت اب

کوشش ناتمام

بھی باقی تھی لیکن جدوجہد کی خواہش محنت کا مقصد باقی نہ رہا تھا۔ ۲۵ سال کی
کامیاب بیرسٹری نے انہیں لکھ پتی بنا دیا تھا۔ وہ دولتمندی کی اس حد تک پہنچ
چکے تھے جب انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کتنے دولتمند ہیں۔ روپیہ، روپیہ پیدا کرتا ہے
برسوں سے ان کے اخراجات باوجود انتہائی اصراف سے رہنے کے نہایت
ہی مختصر تھے۔ ایک بڈھا آدمی کتنے ہی عالیشان مکان میں رہے، درجن بھر نوکر رکھے
سونے کا لقمہ کھلائے پھر بھی دو ڈھائی ہزار ماہوار سے زیادہ خرچ نہیں کر سکتا۔ ان
کی آمدنی تقریباً سات ہزار ماہوار تھی جو کہ ہر سال استعمال نہ ہونے کے باعث
بڑھتی جاتی تھی لیکن ریاض الدین کے لئے اب یہ کچھ معنی نہیں رکھتی تھی۔ زندگی میں
کوئی چیز اب ان کے لئے معنی نہیں رکھتی تھی۔ جب ننھی نجمہ کو بھی موت کے پنجوں
نے ان سے چھین لیا تو وہ آخری زنجیر جو اسے دنیا سے وابستہ کئے ہوئے تھی ٹوٹ
گئی۔ اس کے دونوں بچوں میں سے کوئی زندہ نہ تھا۔ بیوی مر چکی تھی بڑے لڑکے
نے دو چھوٹے بچوں کی پرورش نے کئی برسوں تک انہیں دنیا میں رکھا لیکن
ڈیڑھ سال ہوا بیریا میں ۲۴ سالہ انور اور اس سے ذرا ہی قبل گیارہ سالہ نجمہ
کی موت نے انہیں دنیا کے تعلق سے بالکل ہی آزاد کر دیا تھا۔ اف! یہ آزادی
خدایا تو دشمنوں کو بھی ایسی آزادی اور بے فکری نہ دینا۔ اس کا دل اب ایک

بیکل

ویرانہ تھا۔ ایک اجاڑ کھنڈر۔ ایک تاریک کوٹھڑی جس میں روشنی کی ایک کرن بھی داخل نہیں ہو سکتی۔

ریاض الدین کی ساری عمر انتہائی مصروفیت میں گزری تھی۔ اسے کبھی دوست بنانے یا مطالعہ کرنے کی فرصت نہیں ملی تھی۔ وہ ایک جذباتی آدمی تھا۔ اولاد سے اس کی محبت محدود سی تھی۔

ننھی نجمہ ہی ایک چیز تھی جس نے اس کے دل کے تاروں کو چھیڑا تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ نجمہ کی آمد تک ضعیف ہو چکا تھا یا حریف کو شکست دینے کی خوشی کا وہ ابتدائی جوش کچھ ٹھنڈا ہو چکا تھا بہر حال جو بھی وجہ ہو نجمہ نے اس کے ابتک سخت اور بے پڑا دل کو نرم اور مہربان بنا دیا تھا۔ وہ اس کی گود میں گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتی۔ اس کے کوٹ کے پھول کو لے کر اپنے بالوں میں لگا لیتی اس کے کھردرے چہرے سے اپنے نرم نرم گالوں کو ملتی۔ اور ریاض الدین کا دل اس وقت طمانیت اور سرور سے بھر جاتا۔ لیکن ننھی نجمہ کے مرنے کے بعد اس کا دل پھر ایک سنگلاخ چٹان ہو کر رہ گیا تھا۔ انور کے برما میں مارے جانے کی خبر سے اس کو رنج ہوا لیکن وہ اب ..... "رنج کا خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج" کا مصداق تھا لیکن اگر اسے اس کا احساس نہ ہوا کہ اس کی کثیر دولت کا کوئی وارث

باقی نہیں رہا تو اس کے رشتہ داروں کو انور کی موت کے صرف اس ایک پہلو کا اچھی طرح سے احساس ہوا جس موت نے ریاض الدین کے دل کی آخری شمع بجھا دی۔ اس موت سے اس کے رشتے داروں کی امیدوں کی مشعلیں جل اٹھیں ریاض الدین امیر تھا۔ اس کے رشتہ دار غریب، امیر اور غریب رشتہ داروں کی اقتصادی خلیج ایک دوسرے سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ اس میں امیروں کا بھی قصور ہوتا ہے غریبوں کا بھی۔ ایک طرف غرور محبت کی جڑ کاٹ دیتا ہے تو دوسری طرف حسد اور لالچ گھن کی طرح خلوص اور اپنائیت کو فنا کر دیتی ہے۔ ریاض الدین سخت دل آدمی تھا۔ اس میں آؤ بھگت، تپاک کا مادہ بہت کم تھا۔ وہ اپنے رشتہ داروں کو ان کی کاہلی اور کورمغزی پر محمول کرتا تھا۔ اس لئے اس کو ان سے ہمدردی نہ تھی اور واقعی ان میں سے بعض تو ہمدردی کے اہل بھی نہ تھے۔ اس نے ان کی مدد کی اور اکثر کی۔ لیکن مدد چونکہ ہمدردی کے ساتھ نہ تھی ان کے دلوں میں تشکر کا جذبہ پیدا نہ کر سکی۔ اور جب اس کے باغ حیات میں باد خزاں چلنے لگی تو ان کی تمنائیں ہری ہونے لگیں۔ انور کے بعد ان امیدوں نے یقین کی صورت اختیار کر لی۔ ادھر ریاض الدین کی زندگی کھانے کے مقررہ وقتوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی۔ ہر دن ایک سال کا تھا۔ ہر گھنٹہ ایک مہینہ۔ اس کی نظریں اخباروں کو دیکھتی تھیں پر اس کا دل

چپاتی

کہیں اور ہوتا تھا۔ آجکل کے اخبار کی خبریں۔ موت، تباہی، بربادی کی داستانیں چین میں معصوم عورتوں اور بچوں کا بم کا نشانہ بننے کی داستان نوردوس میں منڈیوں میں ٹھٹھرنے کے ہولناک قصے ہندوستان میں حملے کے خطرات، گرانی کی مشکلات کے ساتھ ہی ساتھ دوسری آفاتِ ناگہانی۔ پہلے تو طوفان نے بنگال پر مصیبت ڈھائی اور اب ان آفت رسیدوں پر قحط کی مار پڑ رہی ہے کلکتہ کی گلیوں سے بھوکے بچوں کی لاشیں روزانہ بیسیوں کی تعداد میں اٹھ رہی ہیں۔ اسی اسی ستر ستر آدمی ہر روز کلکتہ کی گلیوں میں بھوکوں مر رہے ہیں۔ اخبار میں آجکل صرف یہی خبریں ہوتی ہیں۔ ریاض الدین کا دل بےحس ہو چکا تھا وہ لڑائی کی خبریں میدانِ جنگ کے حالات پڑھتا اور اس پر مطلق اثر نہ ہوتا۔ مگر نہ معلوم کیا بات تھی کہ قحط زدگان بنگال کے حالات پڑھ پڑھ کر اس کے دل میں ہیجان شروع ہوا۔ اس کا دل جو ڈیڑھ سال سے کسی قسم کے جذبے سے یکسر خالی تھا اس میں درد کی ٹیس پھر اٹھنے لگی۔ ہر روز صبح کو جب وہ اخبار میں یہ دیکھتا کہ آج ایک سو چالیس لاشیں کلکتہ سے اٹھائی گئیں۔ آج ان چھبیس نیم جان لوگوں میں جو ہسپتال میں داخل کئے گئے تھے دس مر گئے جن میں ۹ بچے تھے۔ جب وہ پڑھتا کہ ہسپتالوں میں جگہ نہیں خیراتی لنگر خانے ناکافی ہیں لوگ بھوک بھوک پکارتے مر رہے ہیں۔ جھوٹے ٹکڑے، پھینکے ہوئے کھانے

کوششِ ناتمام

چن چن کر کھا رہے ہیں۔ تین تین سو میل چل کر گاؤں سے آتے ہیں کہ شاید کلکتہ ایسے سنہری اور دولتمند شہر میں ان کے درد کا درماں ملے گا اور اس کی گلیوں میں آکر بھی جب ناکام رہتے ہیں تو امید کی ڈوری اور اس کے ساتھ حیات کی ڈوری ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔ ان حالات نے اس کے دل میں عجیب کیفیت پیدا کرنی شروع کی۔ اس نے پھر سیاستدانوں کی تقریروں کو دلچسپی سے پڑھنا شروع کیا لیکن اس کی تشفی نہ ہوئی۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے پر معترض تھا۔ لوگ مر رہے تھے اور یہ بحث میں پھنسے ہوئے تھے۔ جانیں جا رہی تھیں اور یہ خود کو الزام سے بری کر رہے تھے اور دوسرے پر الزام لگا رہے تھے۔

ریاض الدین کے دل میں اس خیال نے زور پکڑنا شروع کیا کہ اسے کچھ کرنا چاہئیے اس کو یہ احساس ہونے لگا کہ اس کی زندگی کا مقصد یہی ہے۔ وہ دین دار نہ تھا لیکن اب اس کو یہ محسوس ہونے لگا کہ خدا کی مرضی یہی ہے اور اسی لئے اس کے مل کے ٹکڑے چھینے گئے ہیں کہ اس کی دولت دوسروں کے کام آئے۔ یہ احساس اس کے دل میں دن بدن بڑھ رہا تھا۔ اس کی طبیعت ہمیشہ سے جلد فیصلہ کرنے والی تھی۔ اس خیال کا مستحکم ہونا تھا کہ اس نے عمل کا فیصلہ کر لیا۔

اس نے برسوں کے بعد پہلی دفعہ اپنی دولت کا جائزہ لیا۔ اس کو خود اپنے

پاگل

تمول پر تعجب ہوا اور تعجب کے ساتھ ندامت۔ وہ ایک تنہا آدمی گیارہ لاکھ نقد کا
مالک ہو۔ اس کی ایک ہستی پر بیس ہزار صرف ہوں اور لوگ مٹھی بھر چاول کو ترسیں۔

وہ کلکتہ پہنچا۔ اس نے کئی محلوں میں مکان کرائے پر لئے اور وہاں لنگر اور
ہسپتال قائم کر دیا۔ جب دولت ہو اور دولت کو اس پیمانہ پر استعمال کرنے کی
آمادگی ہو جس پیمانہ پر خود اپنے خویشوں پر کی جاتی ہے تو مصیبت کا ازالہ ناممکن نہیں
لیکن جب جانیں بچانے کا سوال ہوتا ہے، جب بھوکوں کو کھانے کا، ننگوں کو
پہننے کا اور بے گھروں کو گھر میں سلانے کا سوال درپیش ہوتا ہے تو کفایت اور کم
خرچی نصب العین قرار پاتے ہیں۔ اقتصادیات کے بھولے ہوئے سبق یاد آجاتے
ہیں۔ لیکن ریاض الدین کو روپیہ بچانا نہ تھا جانیں بچانی تھیں۔ اس نے پنجاب اور
یو۔پی سے گیہوں کے بورے فرسٹ کلاس کے کمپارٹمنٹ میں منگوانے شروع کئے
اس نے کلکتہ میں مارواڑیوں سے چوگنی قیمت پر ان کے جمع کئے ہوئے چاول
خریدے۔ اس نے فرپو سے روٹیاں منگوانی شروع کیں اور روز ہزاروں کی تعداد
میں لوگوں کو کھلانے اور سلانے کا انتظام منٹوں میں کر لیا۔

زندگی پھر ایک جدوجہد ہو گئی۔ وقت پھر ہوا کی رفتار سے چلنے لگا۔ اس کا
دل پھر ایک طمانیت اور سرور سے بھرا ہوا معلوم ہونے لگا

کوششِ ناتمام

عالمگیر مصیبت کے آ گئے اس کی اپنی مصیبت کی کوئی وقعت باقی نہ رہی
اس نے پہلی دفعہ دیکھا کہ اصلی مصیبت کسے کہتے ہیں۔ وہ غم نہیں جو کہ عالیشان
مکانوں کے اندر آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ کر برداشت کیا جائے۔ پر تکلف کھانے
کھا کر اٹھایا جائے۔ غم یہ تھا کہ بھوکے پیٹ، پھر ایک ٹکڑے روٹی کے آسرے
پر میلوں پیدل چل کر آنا اور بار بار جھڑکیاں کھانی۔ اپنے بچوں کو آنکھوں کے آگے
بھوک سے دم توڑتا دیکھنا اور بے بسی سے دل مسوس کر رہ جانا۔ سر بفلک عماریوں
کے زیر سایہ جہاں سے خوشبودار کھانوں کی مہک نکل نکل کر بھوکوں کو اور بھی تڑپاتی
ہو۔ ایک ٹکڑے کو ترستے ہوئے جان دے دینا۔ جہاں بھوک، بھوک، صرف انسان
کی زندگی کا سب سے ابتدائی احساس باقی رہ گیا ہو۔ جیسا کہ انسانیت اس حد پہ پہنچ
چکی ہو کہ زندہ اور مردہ میں تمیز کی طاقت باقی نہ رہی ہو۔ ایسا سماں اس کی آنکھوں
کے سامنے تھا۔ اس نے اپنے دل سے اپنی مصیبت کا خیال بھی تقریباً بھلا دیا تھا
نہیں وہ مصیبت زدہ نہیں تھا مجرم تھا۔ وہ جس کے پاس اتنا کچھ تھا اس نے
اب تک ان کے لئے جن کے پاس کچھ نہ تھا کیا کیا تھا؟ وہ اپنے سے ہر لحظہ
یہ سوال کرتا اور ہر لمحہ اپنے کھوئے ہوئے وقت کی تلافی میں صرف کرتا۔
اس نے ایک مہینہ کے اندر اندر نو لنگر خانے کلکتہ اور اس کے اطراف

میں کھولدیئے۔ اور وہ صبح سے شام تک انہیں میں ایک سے دوسرے تک پھرتا
رہتا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے لڑکھڑاتے ہوئے لوگوں کو سہارا دیتا اپنی موٹر میں نیم
مردہ، فاقہ زدوں کو اٹھا کر لاتا اپنی گود میں ننھے بچوں کو لٹا کر ان کے منہ میں شوربہ
کے قطرے ٹپکاتا۔ جب کئی گھنٹوں کے دھیرے دھیرے کھلانے کے بعد بچہ
آنکھیں کھولتا تو اس کو اتنی خوشی ہوتی جتنی بچہ کو مسکراتا دیکھ کر ہوا کرتی تھی۔ اس
کا دل اب اجاڑ کھنڈر نہیں پتھر کا ٹکڑا نہیں جذبات سے بھرا
دل تھا وہ پھر زندہ ہو گیا تھا لیکن اس کی زندگی کی خبر اس کے وارثوں کے لئے
پیام موت تھی۔ وہ خود کو اس کے ہونے والے وارث نہیں اس کی جائداد
کا مالک سمجھ چکے تھے اب ڈیڑھ سال میں ان کے دل سے ہر خدشہ مٹ چکا تھا۔ یہ
خبر سن کر ان کے ہوش اڑ گئے۔ اف! ایسے تو گیارہ لاکھ روپئے گیارہ دن میں
ختم ہو جائیں گے۔ ریاض الدین کو اپنی جائداد کے متعلق اب علم ہوا تھا پر اس کے
رشتہ دار اس کے ایک ایک پائی سے واقف تھے۔ ان کی امیدیں ایک دم
سے شکستہ ہو گئیں۔ بڑی بھانجی کو اپنی تین لڑکیوں کے جہیز کی فکر نے آگھیرا۔ منجھلی بھانجی
کے شوہر جو کہ بڑے دوربین آدمی تھے اور جنہوں نے اس سے شادی اسی بھروسے
پر کی تھی کہ ریاض الدین کی جائداد کا کچھ حصہ کبھی ان کے ہاتھ آئے گا ان کو اپنی زندگی

کے سارے منصوبے منہدم ہوتے ہوئے معلوم ہونے لگے۔ بھتیجوں کے یورپ جانیکے
خواب پورے ہوتے نظر نہ آتے دکھائی دینے لگے۔ غرض ان کے آٹھ نو عزیزوں کے
پاؤں تلے سے زمین نکلتی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ وہ سب اکٹھے ہوئے اور سوچنے
لگے کہ کیا کیا جائے۔ کسی کی عقل میں کوئی بات نہ آتی تھی۔ ایک آدمی کو اپنے گاڑھے
پسینہ کی کمائی کو حسب دلخواہ خرچ کرنے کا حق تھا۔ اس کو اپنے حق کی ادائیگی سے
کس طرح روکا جاتے۔ اگر وصیت لکھ جاتے تو وصیت کو پورا نہ کرنا ان کے ہاتھ میں
تھا اگر کوئی یتیم خانہ وغیرہ بنوانا شروع کرتے تو امید تھی کہ اس کی تکمیل میں کچھ وقت
لگے گا۔ اور تب ان کو کچھ سوچنے کا موقع مل جاتا۔ لیکن یہاں تو روزانہ کئی ہزار
روپے صرف ہو رہے تھے۔ ان لوگوں کے دن کا کھانا رات کی نیند حرام ہو گئی۔
بالآخر ریاض الدین کی بھانجی کے شوہر اور اس کے چھوٹے بھتیجے کے شیطانی دماغ
نے مل کر ایک تجویز سوچ لی۔ ریاض الدین کا بھتیجہ اس قسم کا آدمی تھا جس کو یورپ کی
تعلیم سے سوائے جرائم پیشوں کی تقلید کرنے کے شوق کے اور کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اس
کا دماغ شیطانی منصوبوں اور ارادوں کا آماجگاہ تھا۔ اس کی فضول خرچیوں اور اوباشیوں
کو اس کے باپ کی بہت معقول جائداد ناکافی ہوتی۔ اور وہ برسوں سے ریاض الدین
سے روپیہ وصول کر رہا تھا لیکن چونکہ ریاض الدین کبھی خندہ پیشانی سے اس کے مطالبات

کو پورا نہیں کرتا تھا۔ فیض اس کا جانی دشمن بن چکا تھا۔ اس کو تمام عزیزوں میں
سب سے زیادہ ریاض الدین کی موت کا انتظار تھا۔ امیر علی بظاہر گربہ مسکین تھے
لیکن ان کا دل بھی فیض کی طرح سیاہ اور تاریک تھا۔ انہوں نے تقریباً پچاس
سال زندگی سادہ دوسروں کے سر گزاری تھی اور آگے بھی ان کو امید تھی کہ اسی طرح
گزر جائے گی۔ ان میں جرأت نہ تھی فیض میں جرأت تھی۔ دوران گفتگو میں جب
کسی نے کہا کہ اگر وصیت کے ذریعہ ہمیں ناحق کرتا تو ہم وصیت کو یہ کہہ کر معدوم قرار
دلوا سکتے کہ وصیت کے وقت ان کا دماغ درست نہ تھا۔ اس لفظ سے فیض اور امیر
علی دونوں کے دماغ میں بیک وقت ایک ہی خیال محرک ہوا۔ بہت جلد ان
دونوں نے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی ترکیب سوچ لی۔ دونوں کلکتہ پہنچے
اور ریاض الدین سے ملنے گئے۔ ریاض الدین کو ان کی شکل سے نفرت تھی۔ اور جب
انہوں نے اپنے کمینہ خیالات کو بغیر کسی شرم و جھجک کے اس کے آگے پیش کیا
تو ریاض الدین کے صبر کا پیمانہ چھلک چکا۔ اس نے انہیں اپنے گھر سے نکل جانے کو
کہا۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ اور بھی سخت ہو۔ اس کا ضبط جاتا رہے اس لئے وہ اسے ہر
طرح سے غصہ دلاتے رہے۔ یہاں تک کہ تقریباً اس نے انہیں گردن پکڑ کر نکال
دیا۔ اس کے بعد دونوں ایک مشہور لیکن ساتھ ہی ساتھ بدنام ڈاکٹر کے پاس گئے۔

کوشش ناتمام

یہ ڈاکٹر اپنے پیشے میں بہت ماہر تھا لیکن سیاست کی چاٹ نے اسے ڈاکٹری کی مہلت نہ دی تھی۔ وہ کثیر الاولاد تھا اس لئے روپیہ کی ضرورت تھی۔ فیض اور امیر علی نے اپنا قصّہ اس سے بیان کیا۔ ان کا ایک معمول عزیز اپنے پاگل پن سے اپنا سارا روپیہ خرچ کئے ڈالتا ہے۔ اس کے اور ان کے دونوں کے لئے بہتر تھا اگر وہ رانچی بھیجد یا جاتا۔ جہاں اس کی حسب دلخواہ دیکھ بھال ہوتی وغیرہ وغیرہ۔ ڈاکٹر نے کہا کہ پاگل پن کا سرٹیفکیٹ دینے والے ڈاکٹر پر خود بڑی ذمہ داری ہوتی ہے اگر دوسرا ڈاکٹر اس کے سرٹیفکیٹ کو رد کردے تو اس کو سخت نقصان ہوتا ہے اس لئے اس کی فیس بہت بڑی ہوتی ہے۔ فیض اور امیر علی اس کا انتظام کر آئے تھے انہوں نے اس کی بیس ہزار فیس منظور کی اور دوسرے دن اس کو ساتھ لے جانے کا وعدہ کر کے آئے۔

سنہری کنجی ہر تالے کو کھول سکتی ہے۔ فیض اور امیر علی نے مل کر ریاض الدین کے سیکرٹری کو راضی کیا پانچ کے بدلے پچاس ہزار کے چک پر ریاض کے دستخط کروانے جس میں بیس روپیہ ملیں گے۔ وہ پھر ریاض الدین کے سامنے گئے اور اس سے کہا کہ وہ اگر اپنے پاگل پن سے باز نہ آیا تو وہ اسے پاگل خانہ بھیجنے پر مجبور ہوں گے ظاہر ہے کہ اس کا اثر ریاض الدین پر کیا ہوا ہوگا۔ غصّے کے مارے اس کی واقعی

پاگل

پاگلوں کی سی کیفیت ہو گئی۔ کمینہ پن کا مظاہرہ ہمیشہ ریاض کو آپے سے باہر کر دیتا تھا فیض اور امیر علی دونوں یہ جانتے تھے اور یہی دونوں کا ہتھیار تھا۔ انہوں نے اب اپنی پوری تیاری کر لی تھی۔ آخری ایکٹ باقی رہ گیا تھا۔ جب وہ ڈاکٹر کو لے آئے تو ریاض انہیں دیکھتے ہی چیخا "نکل جاؤ بدمعاشو کمینے بے ایمان نکل جاؤ" اور تم بھی بے ایمان ڈاکٹر تم مجھے پاگل خانہ بھجوانا چاہتے ہو۔ میں نہیں جیلخانہ بھجوا کر رہوں گا۔" فیض اور امیر علی کو اس کی امید تھی۔ معاملہ بالکل ان کے حسب منشا چل رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اس آہستگی اور ملائمت سے ریاض الدین سے گفتگو شروع کی جو بچوں یا پاگلوں کے لئے مخصوص ہے۔ اس کا نتیجہ بھی وہی ہوا جس کی انہیں امید تھی۔ یعنی ریاض الدین کو اور بھی غصہ آیا اس نے لپک کر فیض کی گردن پکڑ لی اور انہیں دھکیل کر نکال دیا۔

ڈاکٹر چلا گیا اور جا کر اس نے سرٹیفکیٹ لکھ دیا کہ ریاض الدین پاگل ہے خطرناک پاگل۔ دوسرے دن پولیس مین اور ایک ڈاکٹر ریاض کو لے جانے آئے۔

وہ کہتا رہا بکتا رہا چیختا رہا کہ میں پاگل نہیں ہوں۔ میں پاگل نہیں ہوں۔ پر اس کی شنوائی نہیں ہوئی اس کا یہ سارا شور و شر اس کے پاگل ہونے کی دلیل سمجھی گئی۔ ہر پاگل کہتا ہے میں پاگل نہیں ہوں۔ ہر پاگل گرفتاری کے وقت ہاتھ پاؤں

مارتا ہے۔ حاکموں کا دماغ بہت محدود ہوتا ہے۔ انہیں سمجھنے اور پرکھنے کا مادہ بہت کم ہوتا ہے۔ وہ انسان کو مشین سمجھتے ہیں اور ہر موقع پر یکسانیت کو فیصلے کی دلیل قرار دیتے ہیں۔

دوسرے دن چھ بجے کی گاڑی سے دو مسلح کانسٹیبلوں کے ساتھ ریاض الدین رانچی روانہ کیا جا رہا تھا۔ وہ مسلسل کہے جاتا تھا۔ چیخے جاتا تھا کہ خدارا میری سنو، میں پاگل نہیں۔ غصے اور مجبوری سے اس کی حالت دیوانوں کی سی ہو رہی تھی۔ جو کہ اس کے دشمنوں کے الزام کی تائید کر رہی تھی۔ اس حالت میں وہ ہوڑہ سٹیشن پر لایا گیا۔ اس کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں پڑی تھیں۔ اسے آخری بار کوشش کی۔ اس نے چلا چلا کر سٹیشن والوں کو کہنا شروع کیا، "سنو کوئی خدا کے لئے سنو، میں پاگل نہیں ہوں۔ مجھے عداوت اور دشمنی سے پاگل خانہ بھجوایا جا رہا ہے۔ میں ابھی ابھی کلکتہ میں لنگر خانے قائم کرنے کا کام کرتا رہا ہوں۔ میں نے وہ انتظامی قابلیت کا ثبوت دیا ہے جو کہ تمہاری پوری گورنمنٹ سے نہیں ہو سکتا۔"

بے چارہ پاگل! لوگ ترحم اور خوف آمیز نگاہوں سے اس کو دیکھنے لگے۔

خود کو بادشاہ یا گورنمنٹ کے برابر سمجھنا خاص پاگلوں کا کام ہے!

ریاض الدین کو یقین ہو گیا کہ وہ اپنے دشمنوں کے ڈراؤنے منصوبوں کا شکار ہونے سے بچ نہیں سکتا۔ اس کی کوئی نہیں سنے گا۔ ایک مرتبہ رانچی پہنچ

پاگل

گیا تو اس کو زندگی کے باقی دن قید میں گزارنے پڑیں گے۔ وہ جس کا دماغ ہیرے کی طرح روشن تھا اسے پاگلوں میں رکھ کر پاگل کر دیا جائے گا۔ رہائی کی کوئی صورت نہیں تھی۔ وہ ریل آرہی تھی جو اس کو اس کی قبر میں زندہ لے جانے والی تھی وہ سانپ کی طرح پھنپھناتی زناٹے بھرتی چلی آرہی تھی۔ پلیٹ فارم اس کے دھچکے سے دہل رہا تھا۔ وہ قریب آرہی تھی، اب بالکل قریب، انجن کا دھواں منہ پہ آنے لگا تھا۔ اس کے ہاتھ بندھے تھے۔ ہتھکڑیوں کی رسی سپاہی ڈھیلی پکڑے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے پورے زور سے ایک جست کی اور انجن کے نیچے جا گرا۔

دوسرے دن اخباروں میں ایک چھوٹا سا نوٹس ایک کونے میں چھپا ہوا تھا۔

"مسٹر ریاض الدین جو کبھی کلکتہ کے درخشاں ستاروں میں سے تھے جن کی شہرت ہندوستان سے باہر تک پہنچی ہوئی تھی لیکن جو چند سال سے بالکل خموشی کی زندگی بسر کر رہے تھے قحط آئی تو بڑے جوش و خروش سے قحط زدگان کی امداد کا کام شروع کیا۔ لیکن اس عمر میں یہ محنت اور مصیبت کی شدت نے شاید ان کے اعصاب پر برا اثر ڈالا کیونکہ کل شام کو انہوں نے ریل کے آگے آکر خودکشی کر لی۔ ڈاکٹروں کو ان کے دماغ کی صحت میں شبہ ہوا تھا اور بغرض علاج رانچی لئے جا رہے تھے۔ جبکہ یہ حادثہ پیش آیا۔"

گوشۂ عافیت

"فہمیدہ خالہ لکھتی ہیں کہ نذیر کی طبیعت اچھی نہیں رہتی اگر تم لوگوں کو تکلیف نہ ہو
تو ہم بھی تمہارے ساتھ پہاڑ پر چلیں۔" صالحہ نے صبح کی ڈاک سے آئے ہوئے خطوں
میں سے ایک خط کی یہ دو سطریں رشید کو سنائیں تو دیکھا کہ رشید کا چہرہ بدل گیا۔
اور اس پر ناراضگی کے آثار صاف نمایاں تھے پورے دو سال ہو گئے تھے کہ رشید
نے ایک دن کی بھی چھٹی نہیں لی تھی اور اس عرصہ میں وہ آئے دن کے مہمانوں سے
تنگ آ گیا تھا جب سے ہوشیار پور سے لاہور تبدیلی ہوئی تھی ان کا گھر اچھا
خاصا سرائے ہوٹل یا مہمان خانہ بن گیا تھا۔ کوئی ہفتہ ایسا نہ گزرتا کہ ایک نہ ایک
مہمان ان کے یہاں نہ آئے بعض تو ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو مہینہ تک جانے کا نام نہ لیتے تھے۔

کوشش ناتمام

صالحہ عدد درجہ کی مہمان نواز تھی اسے مہمانوں کے آنے سے بڑی خوشی ہوتی تھی وہ انہیں لاہور کی مشہور عمارات ۔ اسکول و کالج وغیرہ کی سیر کراتی۔ لاہور کے نامور لوگوں سے ملاتی لیکن ہر چیز کی حد ہوتی ہے دو سال کی مسلسل مہمان داری سے صالحہ گھبرا اور اکتا گئی تھی اور اس سے زیادہ اس کے شوہر اور بچے۔ حمید سترہ سال کا تھا اور ایف اے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا اس کو گھر میں سکون اور آرام کی ضرورت تھی لیکن دو سال میں بیسیوں دفعہ اس کو اپنا کمرہ چھوڑ کر باپ کے کمرے میں آنا پڑا اس نے تنگ آکر دوستوں کے یہاں پڑھنا شروع کر دیا تھا اور کبھی کبھی رات کا کھانا کھا کر وہیں سو جاتا تھا ۔ اس کا اصرار تھا کہ ہوسٹل میں رہنے کی اسے اجازت دے دی جائے کیونکہ گھر پر مہمانوں کی مہربانی سے پڑھائی نہیں ہوتی۔ رشید کو شکایت تھی ۔ اپنے گھر میں اسے آرام نہیں ملتا اور کوئی گھڑی سکون کے ساتھ نہیں گذرتی اور کبھی کئی ہفتے گزر جاتے ہیں اسے اپنے بچوں سے بے تکلفی سے باتیں کرنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ گرمی ہو یا جاڑا گھر میں بھی سوٹ یا شیروانی میں جکڑا رہنا پڑتا ہے بے تکلفی سے کرتہ پاجامہ پہن کر بیٹھ نہیں سکتا، کیونکہ ہمیشہ مہمان اور مہمانوں سے ملنے والے گھر میں گھسے رہتے ہیں ۔ صالحہ الگ سب کی تکلیف محسوس کرتی تھی ۔ مہمانداری کے اخراجات اور دوسرے فرائض سے وہ

گوشۂ عافیت

تھک گئی تھی شالامار باغ اور نور جہاں کے مقبرہ پر ہر ہفتہ ٹامس کوک کے گائیڈ کی طرح ان کو لے جاتے لے جاتے اس کی وہ ساری دلچسپی جو پرانی عمارتوں سے تھی ختم ہو گئی تھی اور اب یہ صرف فرض سا ہو گیا تھا دوستوں کے ساتھ شاپنگ کرتے کرتے شاپنگ سے اس کا ایسا جی بیزار ہو گیا تھا کہ رافعہ کے دو پٹے سینے کے قابل نہ رہے تھے اسے دوپٹہ دلانے کے لئے جانے کو اس کا دل نہیں چاہتا تھا۔ خود اپنی ساریاں پرانی ہو گئی تھیں۔ لیکن جہاں اس نے سوچا کہ پرسوں رافعہ کو لے کر چندی مل کے یہاں جاؤں گی کوئی نہ کوئی مہمان نازل ہو جاتا۔ مہمانوں کی آؤ بھگت، خاطر مدارات اور ان کے شاپنگ میں اپنا کام رہ جاتا۔ دو سال سے یہی ہو رہا تھا اور اب صالحہ پریشان ہو گئی تھی لیکن میزبانی کے فرائض سے کسی طرح بھی انکار کرنے کی اس میں جرأت نہ تھی اس کے گھر کا شیرازہ بکھر رہا تھا اور اس کو اس کا احساس بھی نہ تھا کیونکہ اسے وقت ہی نہیں ملتا تھا کہ چند منٹ وہ بیٹھ کر سوچ سکے کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا کرنا چاہیئے جب رشید نے چھٹی لی تو اس کو بے حد خوشی ہوئی کہ دو مہینے کامل آرام اور سکون سے گذریں گے لیکن ابھی پہاڑ پہونچی بھی نہیں تھی کہ خالہ فہمیدہ کے خط نے ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا صالحہ نے دو دن تک جواب نہیں دیا۔ رشید سے کئی دفعہ صلاح

لی ۔ رشید نے ہر دفعہ یہی کہا کہ لکھ دو ہم نے بہت چھوٹا سا گھر لیا ہے آپ کو تکلیف ہو گی۔ صالحہ نے کہا کہ وہ تو پہلے سے لکھ رہی ہیں کہ مجھ کو الگ کمرے کی ضرورت نہیں۔ نذیر حمید کے ساتھ سوئے گا اور میں تمہارے اور رافعہ کے ساتھ بارآمدے میں کسی کونے میں پڑ رہوں گی۔ رشید نے آخر جل کر کہہ دیا کہ پھر مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے جو تمہارا دل چاہے لکھ دو۔ صالحہ نے دو دن کی کشمکش کے بعد خالہ فہمیدہ کو لکھ دیا کہ "آنکھوں پر تشریف لائیے لیکن پندرہ بیس دن بعد کیونکہ شاید رشید کے بھائی آ رہے ہیں۔" یہ بہانہ اس نے اس لئے لکھا کہ چند دن سکون سے گزر جائیں۔ اس کے ناخواندہ مہمان اس کی مہمان نواز طبیعت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔ اور اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ صاف صاف انکار کر سکے اس لئے ایسے بہانے بناتی تھی۔ مگر اس طرح کہ مہمان کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔

صالحہ اور رشید، حمید، رافعہ اور ننھے سعید کو لے کر سولن پہنچے دو چار روز گھر ٹھیک ٹھاک کرنے میں گزرے۔ پھر ان لوگوں نے سیر کرنی شروع کی روزانہ صبح ناشتہ کے بعد چلے جاتے کسی دن کھانا بھی ساتھ لے لیتے رات کو سب مل کر بیٹھے باتیں کرتے۔ صالحہ کو برسوں کے بعد کسی قدر سکون ملا تھا۔ وہ اس قدر تھکی

ہوتی تھی کہ دن کے بیشتر حصّہ میں سوتی رہتی تھی۔ لیکن ابھی اس کے تھکے ہوئے اعصاب درست بھی نہ ہوئے تھے کہ خالہ فہمیدہ کا خط آیا کہ رشید کے بھائی واپس ہو چکے ہیں تو وہ آجائیں کیونکہ نذیر کی کالج کی چھٹیاں شروع ہو چکی تھیں اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی چھٹی کے دن لدھیانہ میں برباد ہوں۔ صالحہ نے رشید سے مشورہ لئے بغیر ہاں لکھ دیا اور وہ چوتھے ہی دن آدھمکیں۔ رشید نے ان کی آمد کا تار دیکھ کر پوچھا "آج تو بارہ ہی ہے یہ ابھی سے آگئیں؟" صالحہ کے چہرے کو دیکھ کر رشید سمجھ گئے کہ صالحہ نے اجازت دے دی ہوگی ایک ہفتہ بعد امن ختم ہوا۔ رشید اخبار اٹھا کر یہ کہتے ہوئے باہر چلے گئے "میں کھانے پر نہ آؤنگا میرا انتظار مت کرنا۔" حمید میز پر سے اٹھ کر جا ہی رہا تھا کہ صالحہ نے کہا "بیٹا تم رکشا لے کر موٹر سٹینڈ چلے جاؤ۔" حمید نے کہا "کیوں وہ اپنا بڑا اڈھو نذیر کیا رکشا لے کر یہاں تک نہیں آسکتا؟" "نہیں بیٹا آ تو سکتا ہے لیکن برا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نہ جائے۔" "انہیں بلایا کس نے ہے؟" حمید نے جواب دیا۔ بہر حال صالحہ کے کہنے سننے پر وہ راضی ہو گیا لیکن اس نے صاف کہہ دیا کہ "اگر آپ نے میرے کمرہ میں نذیر کو ٹھیرایا تو میں واپس لاہور چلا جاؤں گا۔" رفٹ کا تو میرا کمرہ ہے اس میں میں بھی ہوں اور میری کتابیں بھی۔" صالحہ نے کہا "میں نے پیچھے کے برآمدے

میں نذیرہ کا پلنگ بچھوا دوں گی۔ صالحہ جانتی تھی کہ لاڈ سے نذیرہ کو خالہ کبھی
برآمدہ میں نہیں سونے دیں گی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے اس
کے کمرے میں ایک پلنگ کی گنجائش وہ بھی مشکل سے نکل سکتی تھی۔ رافعہ
کی سنگار میز جس پر اس کی دستکاری کی چیزیں سجا کر رکھی گئی تھیں اٹھا کر خالہ
کا پلنگ بچھایا گیا جس پر رافعہ بہت ہی جز بز ہوئی مگر ماں کی مہمان نواز
طبیعت کے لئے آگے اس کی ایک بھی نہ چل سکی۔

دو بجے خالہ فہمیدہ مع نذیرہ کے آدھمکیں گاڑی لیٹ تھی سب کی آنتیں
قل ھو اللہ پڑھ رہی تھیں مگر صالحہ کی مجال نہ تھی کہ کھانا کھالے۔ جب خالہ منہ
ہاتھ دھو کر کھانے کے میز پر تشریف لائیں تو تین بج چکے تھے نوکروں کے بھی
تیور الگ چڑھے ہوئے تھے یہ بھی روز روز کی مہمان داری سے تنگ آگئے تھے
اور پہاڑ پر انہیں بھی آرام کی امید تھی کھانا ختم ہوتے چائے کا وقت آگیا اور
چائے کے بعد خالہ فہمیدہ اور نذیرہ بہت دیر تک پچھلے برآمدے میں سرگوشیاں
کرتی رہیں جب خالہ وہاں سے اٹھیں تو ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ نذیرہ کا پلنگ برآمدہ
میں بچھانا خالہ کو سخت ناگوار گزرا وہ بہت دیر تک پہاڑ کی سردی اور اس کے
خطرات کا ذکر کرتی رہیں۔ رافعہ نے بے پروائی سے جواب دیا کہ اب تک تو

گوشۂ عافیت

لوگوں کو گرم کپڑوں کی ضرورت نہیں ہوئی اور دیکھئے صرف ایک ہلکا سا
لحاف اوڑھتے ہیں لیکن خالہ جبیں بہ جبیں ہی رہیں۔ ان دو مہمانوں کا آنا تھا کہ گھر
سے وہ سکون اور وہ یک رنگ جیسا ماحول جاتا رہا۔ صبح کا ناشتہ کر کے رشید
اور بچے سویرے ہی نکل جاتے تھے۔ میاں نذیر اور خالہ نو ساڑھے نو سے پہلے
تیار نہ ہوتے ان کے ناشتہ کے بعد دھوپ اس قدر تیز ہو جاتی تھی کہ سیر کا وقت
ہی نہ رہتا تھا۔ دن کے کھانے کو بھی دیر ہو جاتی رشید خفا ہوتے تو نوکر کہتے کہ
حضور ساڑھے دس بجے تو ناشتہ ہوا ہے۔ شام کی چائے پر رشید صالحہ ایک ایک
پیالی چائے کی پیتے تھے بچے ایک آدھ بسکٹ کھا لیتے تھے لیکن مہمانوں کے لئے
ناشتہ کا انتظام ضروری تھا اور خالہ فہمیدہ اور نذیر گھنٹوں چائے کی میز پر بیٹھے رہتے
حمیدہ اور رافعہ تو ایک ایک پیالی پی کر اٹھ کھڑے ہوتے اور یہ کہتے ہوئے
کہ اماں ہم سیر کو جاتیں چل دیتے۔ رشید نے اپنے کمرے ہی میں چائے پینی شروع
کر دی تھی اور اکثر اوقات دن کا کھانا اور شام کی چائے کسی دوست کے یہاں پی کر
صبح کے گئے شام کو آتے تھے خالہ فہمیدہ نے دو تین دن کے بعد حمیدہ اور رافعہ
پر دبے الفاظ میں اعتراضات شروع کئے صالحہ کو ہمدردی کے پردہ میں یہ بتلانا شروع
کیا کہ اس کے بچے بہت بدتمیز اور بدخلق ہیں اور ماں کے مزاج میں لاپرواہی

کوششِ ناتمام

ہے ایک دن کہا "رشید یہاں دن دن بھر کس کے ہاں رہتے ہیں" صالحہ نے ان سے تو یہ کہا کہ "مجھے نہیں معلوم" اور دل میں کہا کہ "آپ کے جھگڑے سننے سے فرصت ملے تو ان سے پوچھوں" دوسرا حملہ خالہ کا حمید پر تھا حمید چونکہ نذیر سے بیزار تھا اس لئے خالہ کا اس سے ناراض ہونا ضروری تھا خالہ کی زبانی صالحہ کو تو پہلی مرتبہ حمید کے سگریٹ پینے کا علم ہوا خالہ نے فخریہ لہجہ میں کہا "نذیر اللہ رکھے اکیسویں سال میں ہے لیکن اب تک سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا" صالحہ کو جب یہ علم ہوا کہ حمید سگریٹ پیتا ہے تو اسے واقعی بہت افسوس ہوا اگرچہ اس قدر کم عمری میں سگریٹ پینے کے بھی وہ خلاف تھی لیکن اس کو قلق اس وجہ سے زیادہ ہوا کہ حمید نے اس سے چھپایا صالحہ نے حمید سے شکایت کی تو حمید نے کہا کہ ہریش کے ہاں جہاں وہ اکثر پڑھنے جاتا تھا یہ عادت پڑی ہے ماں نے پوچھا "مجھ سے کیوں چھپایا؟" حمید نے کہا "آپ کو فرصت کہاں ہوتی ہے کہ آپ سے کوئی بات کی جائے" رافعہ کے لپ سٹک اور رینچ گلون کے جمپر پر بھی خالہ کے اعتراض نے صالحہ کو متوجہ کیا لیکن رافعہ سے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی اسے معلوم تھا کہ رافعہ وہی جواب دے گی جو حمید نے دیا ہے یعنی آپ کو فرصت کہاں کہ آپ سے کچھ بتائیں یا سمجھائیں" آپ کو جمپر بنانے کے لئے کہتے

کہنے تھک گئی۔ جب آپ نے توجہ نہ کی تو جیسا میری سمجھ میں آیا ہوا لیا۔

رشید کا اب معمول ہو گیا تھا کہ روزانہ صبح کے گئے رات کو واپس آتے
اور رات کا کھانا خاموشی کے ساتھ کھا کر اپنے کمرے میں چلے جاتے ڈرائنگ
روم میں صرف صالحہ خالہ اور نذیر ہوتے تھے کبھی کبھی رافعہ ایک کونے میں بیٹھی
کتاب پڑھنے کی کوشش کرتی لیکن خالہ کی مسلسل گفتگو سے تنگ آ کر کتاب بند
کر کے اپنے کمرہ میں چلی جاتی نذیر اکثر اوقات ماں اور صالحہ کو باتیں کرتا چھوڑ
کر حمید کے کمرہ میں جا بیٹھتا اور اس کا دماغ چاٹنا شروع کر دیتا۔ حمید کو نذیر کی صورت
بری لگتی تھی حمید سنجیدہ مزاج اور پڑھنے کا شوقین لڑکا تھا نذیر حد درجہ کا بد شوق سینما
کا دلدادہ ایکٹرسوں کا شیدا جب تھوڑی سے زکام کے بہانے سے نذیر کا
پلنگ حمید کے کمرے میں آ گیا۔ تو وہ تنگ آ کر روزانہ سینما جانے لگا کیونکہ اس
کا کوئی دوست نہیں تھا جس کے ہاں وہ جاتا صالحہ سے روپے مانگے تو اس
نے کہا "یہ روزانہ کی عادت کیوں ڈال رہے ہو" تو اس نے کہا "جب تک
نذیر گھر میں ہے مجھ سے گھر میں نہیں رہا جائیگا" صالحہ اس کا کیا جواب دیتی
اب اس ڈر سے اس کا خون خشک ہونے لگا کہ سگریٹ کے ساتھ ساتھ
اگر سینما جانے کی لت پڑ گئی تو آئندہ کی خیر نہیں یہی عمر تھی جب ایک دفعہ

غلط راستے پر قدم پڑ جائے تو زندگی بھر اسی راہ پر انسان چلتا ہے۔

خالہ کو آئے ہوئے ایک

مہینہ ہونے آیا تھا اس عرصہ میں رشید تقریباً روزانہ ہی باہر رہا اگرچہ صالحہ کو نذیر

کے کہے کا اعتبار نہ تھا۔ تب بھی اس کے دل میں یہ بات کھٹکنے لگی کہ نذیر نے کئی

دفعہ رشید کو ایک میم کے ساتھ سیر کرتے ہوئے دیکھا تھا صالحہ کو معلوم تھا کہ

رشید اپنے دوست احمد علی کے یہاں زیادہ وقت گزارتے ہیں ان کی بیوی

میم تھی لیکن اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جس کے ساتھ رشید کو سیر

کرتے ہوئے نذیر نے دیکھا ہے وہ مسز احمد نہ تھی خالہ کے دکھڑے نذیر کی ناز برداریاں

نوکروں کے مزاج دادی بچوں کی خاموش ناراضگی نے صالحہ کو ایسا ہراساں کر رکھا

تھا کہ اسے یہ خود کرنے کی مہلت نہ تھی کہ رشید نے ہفتوں سے اس سے بات

کرنی چھوڑ رکھی ہے سچ پوچھئے تو اس میں اس کا قصور بھی نہ تھا بات کرنے کی

مہلت ہی نہ ملتی تھی خالہ سایہ کی طرح سر پر ہمیشہ سوار تھیں دن اور رات ان کی

زبان اس تیزی سے چلتی تھی کہ کسی کو کچھ کہنے سننے کی نوبت نہ آسکتی تھی لاہور کا گھر

بڑا تھا وہاں مہمان اس طرح ہر وقت اور ہر لحظہ سر پر سوار نہ رہتے تھے لیکن پہاڑ

کے چھوٹے سے گھر میں تو سب گھنٹے میں پل بھر کو ان سے نجات نہ ملتی تھی اور

گوشۂ عافیت

خالہ قیس بدترین قسم کی مہمان جن کو دنیا کا کچھ کام ہی نہ تھا کہ گھڑی دو گھڑی میزبان
کو چھوڑیں اور وہ اپنا کچھ کام کر سکے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی طبیعت اس قسم کی
تھی کہ اگر ان سے مسلسل باتیں نہ کی جائیں تو وہ اس کو اپنی ہتک سمجھتی تھیں صالحہ
کمزور طبیعت صالحہ کسی کی ناراضگی برداشت نہ کر سکتی تھی اس سے وہ لڑکے
لڑکی اور شوہر کی بداخلاقی کو اپنی مسلسل توجہ اور انہماک سے ڈھکنا چاہتی تھی
اور اس کوشش میں اپنی زندگی کی بہترین چیزوں کو کھو رہی تھی ایک دن رابعہ
کے اصرار سے صالحہ ایلیزم کی طرف چلی گئی خالہ رکشا میں سوار تھیں چائے کا
سامان بھی رکھ لیا تھا یہ پکنک تھی بس یہی خالہ کے آنے کے بعد صالحہ
چاہ رہی تھی حمید اور رشید ساتھ نہ تھے ان کے جانے کے بعد یہ لوگ روانہ ہوئے تھے
چائے پینے کے بعد خالہ تو لیٹ گئیں اور صالحہ اور رابعہ نے پہاڑی پر چڑھنا
شروع کیا پہاڑی کے اوپر چھوٹا سا شیڈ تھا پکنک کی اصل جگہ وہی تھی لیکن
خالہ سے اتنی چڑھائی بھی ممکن نہ تھی اس لئے نیچے چائے پی گئی یہ لوگ شیڈ کے پاس
آئے تو دیکھا کہ ایک میم اور اس کے ساتھ ایک مرد لوبیاں منہ پہ رکھے
ہوئے ہیں اگرچہ ٹوپی منہ پر تھی لیکن ایک نظر میں ہی صالحہ کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ
مرد رشید ہے ان کے قدموں کی آہٹ پا کر وہ دونوں اٹھ بیٹھے صالحہ نے

دیکھا کہ بیگم مسز احمد علی نہیں کوئی اور ہے قبول صورت کم سن ۔

تھکان تفکرات کا ہجوم تعجب کا اور رنج کا مخدرہ اثر یہ ہوا کہ صالحہ کی آنکھوں تلے اندھیرا آگیا اور وہ گر پڑتی اگر رافعہ لپک کر اسے پکڑ نہ لیتی رشید اس کا کاغذ سے زیادہ سفید چہرہ دیکھ کر بے اختیار چلا اٹھے "ارے صالحہ تم کو کیا ہو رہا ہے" اور رافعہ کے ساتھ صالحہ کو پکڑ کر بنچ پر لائے بیگم حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی اور رشید کو اپنی بیوی کی حالت پر اس قدر زیادہ فکرمند دیکھ کر ایک مختصر گڈ بائی کہتی ہوئی چل دی صالحہ کا دل زور سے دھڑک رہا تھا اس کی [illegible] زندگی کی بنیادیں ہل گئی تھیں اس کا دل چاہتا تھا کہ منہ ڈھانک کر خوب روئے لیکن لڑکی کا خیال تھا۔ رشید دیکھ رہے تھے کہ صالحہ کی حالت بہت خراب ہے اور اگر وہ اسی طرح ضبط کرتی رہی تو اس کا بہت برا اثر ہوگا انھوں نے رافعہ سے کہا کہ "گھر جا کر رکشا بھیجے اور نیچے نانی جو ہیں انہیں بھی لے جاؤ اور خدا کے لیے انھیں اوپر نہ لانا" رافعہ کے جانے کے بعد رشید اور صالحہ نے باتیں شروع کیں ڈیڑھ مہینہ!) دو سال بعد یہ پہلا موقع تھا کہ بغیر کسی کھٹکے کے وہ باتیں کر سکے رشید نے اعتراف کیا کہ وہ گذشتہ ایک مہینے سے برابر مس ایلڈروز کے ساتھ پکنک وغیرہ کرتا رہا یہ مسز

گوشۂ عافیت

احمد علی کی دوست تھی اور ان کے ہاں ان کی ملاقات ہوئی تھی جب اپنے گھر میں
انسان کو جگہ نہ ہو اور ہر وقت بھی اپنی بیوی سے باتیں کرنے کی مہلت نہ ملے
تو کوئی کیا کرے؟ اور صالحہ کے دل نے کہا کہ رشید کا یہ اعتراض بالکل بجا ہے
غیروں اور نام نہاد عزیزوں کی خاطر مدارات اور دلجوئی میں وہ ایسی مشغول تھی
کہ اس نے اپنے اصلی فرائض بالکل ہی بھلا دیئے تھے۔ نہ وہ شوہر کی رفیق رہی
تھی اور نہ بچوں کی ہمدرد۔ ان کا گھر ان کے لئے گوشۂ عافیت اور کنج راحت ہونا
چاہیئے تھا اس کو اس نے ہوٹل اور سرائے سے بدتر بنا رکھا تھا کیا تعجب تھا اگر
شوہر اور بچے ایسے گھر اور ایسی بیوی اور ماں سے متنفر ہوئے جاتے تھے
صالحہ ان خیالات میں محو تھی کہ رشید نے کہا "دیکھو صالحہ تمہاری صحت بالکل
جواب دے چکی میں نے چھٹی اس لئے لی تھی کہ تمہیں اور مجھے کچھ آرام اور سکون
نصیب ہو لیکن یہ نہیں ہوا آخر میں ایک مہینہ اپنی چھٹی اور بڑھوا لیتا ہوں
بشرطیکہ تم خالہ فہمیدہ اور ان کے لخت جگر کو رخصت کر دو"

صالحہ نے کہا کہ "اس سے زیادہ اسے اور کسی چیز سے خوشی نہ ہوگی جتنی
خالہ فہمیدہ کے چلے جانے سے" اور پھر اس کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو بھر
آئے اور اس نے کہا "لیکن انہیں کس طرح کہے" رشید نے کہا "وہ دیکھو تو

کوششِ ناتمام

رہی ہیں کہ ان کے رہنے سے کسی کو خوشی نہیں مگر ان پر اس کا خاک اثر ہوتا
ہے ایسے لوگوں کے ساتھ مروّت فضول ہے خالہ فہمیدہ کچھ ایسی غریب
نہیں ہیں وہ چاہیں تو خود گھر لے کر بہار پر رہ سکتی ہیں تم اجازت دو میں انہیں
کل رخصت کر دیتا ہوں ۔ میاں بیوی دو گھنٹے تک ٹیلے پر بیٹھے باتیں کرتے رہے
حمید کی سگریٹ نوشی کا شوق رافعہ کی بڑھتی ہوئی آزادی غرض وہ تمام باتیں
جن سے صالحہ پریشان تھی اور چاہیئے تھا کہ وہ اور رشید مل کر ان پر غور
کرتے آج ان پر دونوں کی گفتگو ہوئی وہ گھر آئی تو تھکی ہوئی لیکن اس کے
دل میں آج پہلی دفعہ سکون تھا گھر پہنچتے ہی رشید نے اسے لیٹ جانے
کو کہا اور خالہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ صالحہ کی صحت بہت خراب ہو گئی
ہے اور مہمان داری کا بوجھ اٹھانے کی اس میں بالکل طاقت نہیں لہذا آپ
اور نذیر براے مہربانی تشریف لے جائیں خالہ کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی
وہ تو اس امید میں تھیں کہ صالحہ سے مل مل کر خوب رشید کے پرخچے
اڑائیں گی یہاں یہ رنگ دیکھا کہ دل میں پکتی جھلکتی نذیر کو دو چار کوسنے اور
گالیاں دیتی رہیں لے کہاں ہے وہ ناشدنی جس کی وجہ سے یہ ذلتیں اٹھاتی
پھرتی ہوں چلو نکالا مل گیا سامان باندھو ارے کیوں کیا ہو چکا ہے کوئی تیر

گوشۂ عافیت

یاد اکا گھر ہے اللہ کی شان یہ صالحہ ہیں جو اتنی سی تھیں تو خالہ جان کہتے
منہ تھکتا تھا اب خیر سے گھر والی ہو گئیں تو ایسے دیدے بدلے۔ خیر میں بھی
انشاء اللہ اب اس کی ڈیوڑھی میں قدم نہ رکھوں گی" دیوار بیچ کمرے میں صالحہ
سب کچھ سن رہی تھی اس کی فطرت کا تقاضا تھا کہ جائے اور اٹھ کر خالہ کو
منا کر روک لے لیکن اس میں اتنی طاقت نہ تھی اور بہار پر اس کو جو احساس ہوا
تھا کہ وہ سونے کے بدلے پتھر جمع کر رہی ہے وہ احساس ابھی قائم تھا نہیں وہ
نہیں اٹھے گی خالہ چاہے کتنی ہی جز بز ہوں وہ اور ان جیسی ناخواندہ مہمانوں سے
اس کا گوشۂ عافیت اب اور آئندہ ہوٹل سے بدتر نہ بنے گا۔

تصویر کا دوسرا رُخ

کئی مہینے ہو گئے تھے کہ زینت آپا سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ روز
کہتی تھی کہ آج جاؤں گی کل جاؤں گی لیکن کوئی نہ کوئی کام ایسا آ پڑتا تھا کہ جانا
نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے کل صبح میں ارادہ کر کے اٹھی کہ آج تو سب کام چھوڑ کر
زینت آپا کے یہاں ہو ہی آؤں گی۔ لیکن پھر بھی جاتے جاتے تین بج ہی گئے۔
میں پہونچی تو دیکھا کہ زینت آپا تخت پہ بیٹھی بال سکھا رہی ہیں۔ مجھے دیکھ کر بہت
خوش ہوئیں۔ جاڑے کے دن تھے میں بھی وہیں دھوپ میں ان کے پاس بیٹھ
گئی۔ تین مہینے تین مہینے بعد ملے تھے خیال تھا کہ ہزاروں باتیں ہونگی
لیکن میں دیکھ رہی تھی کہ ہر دس پانچ منٹ بعد زینت آپا چپ ہو جاتی تھیں

ان کا دل کہیں اور تھا آخر مجبوراً بغیر پوچھے رہا نہیں گیا میں نے کہا زینت
آپا تم کھوئی کھوئی سی کیسی ہو گئیں۔ ہاں بی بی ہے، تم سے کہنا نہیں چاہتی
تھی کہ اتنے دنوں میں تو تم آئی ہو تمہارا دل بھی خراب ہو جائے گا میں ابھی ابھی
بیچارے عزیز میاں کی میت سے آ رہی ہوں۔ ابھی نہا کر آ کر بیٹھی تھی کہ
تم آ گئیں۔

عزیز میاں کون؟ ارے عزیز میاں کو جانتی نہیں فرخندہ کے شوہر۔ زینت
آپا نے کہا۔ اچھا اللہ مغفرت کرے میں نے کہا اور پھر کچھ ٹھہر کر کہا ویسے
موت کسی کی بھی ہو افسوس ناک ہے لیکن ان بیچارے کا مرنا اچھا کچھ حادثہ نہیں
فرخندہ سے کبھی ان کی بنی ہی نہیں۔ ایک لڑکا ہے سو جوان اسے بھی ان
سے کوئی خاص تعلق نہیں رہا ہے۔ زینت آپا بولیں مجھے تو اس بیچارے کی زندگی
پر افسوس آ رہا ہے۔ یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ نہ فرخندہ کو اور نہ اس کے لڑکے
کو ان کے مرنے کا غم ہے لیکن آپا انصاف سے دیکھتے ہوئے غم ہو بھی
کیسے سکتا ہے فرخندہ کا اور ان کا کیا۔۔۔۔ میں بات ختم بھی نہ کرنے پائی تھی کہ
زینت آپا خفا ہو کر بولیں ہاں ہاں مجھے سب معلوم ہے فرخندہ کا اور اس بیچارے
کا کیا جوڑ تھا فرخندہ خوبصورت تیز طرار نامی گرامی گھرانے کی بولنے چالنے

ہیں ملنے جلنے میں سب سے آگے۔ ہنر سلیقے والی غرض ہر طرح سے قابل تعریف
اس بیچاری سیدھی سادی اجڈ دیہاتی کو کس طرح خاطر تلے لا سکتی تھی۔
جس کی زبان مجلس . . . میں نہیں کھلتی تھی جس کے لب و لہجہ تک پہ فرخندہ کے
چچا ماموں بھائی بھتیجے ٹھٹھے لگاتے تھے جو کالر ٹائی سوٹ بوٹ کے راز سے
بالکل ہی ناواقف تھا بھلا کمخواب اور گاڑھے کا کیا مقابلہ یہی آج بائیس
برس سے فرخندہ کا سارا خاندان بلکہ سارا قصبہ سارا شہر یہی کہتا آیا ہے۔ لیکن نزہت
آپا واقعی ہی تو یہ ہے نا۔ اب آپ خود ہی مان رہی ہیں کہ فرخندہ ہزاروں میں
ایک ہیں ایک سو آدمی میں بیٹھا دیجیے جھجکیں نہ ڈریں۔ قینچی کی طرح زبان چلتی
ہے کنبے محلے کا کوئی کام ہو ان سے صلاح لی جاتی ہے ان کی رائے سے سب
کچھ ہوتا ہے شادی بیاہ کا انتظام خاندان بھر کا وہ کرتی ہیں اور ان کا شوہر
ایسا بدھو۔ بھلا کس طرح وہ اس کی عزت کر سکتی تھیں صرف روپیے سے کیا ہوتا ہے
ہاں بی بی ٹھیک ہے۔ تم لوگوں نے دو چار لفظ اخباروں رسالوں سے سیکھ
لئے ہیں اسے رٹے جاتی ہو۔ خیالات اور طبیعتوں کا ایک ہونا ضروری ہے روپے
سے کیا ہوتا ہے اور میں کب کہتی ہوں کہ ضروری نہیں یا روپے سے سب عیبوں
پہ پردہ پڑ جاتا ہے میں تو کہہ رہی ہوں کہ طبیعتوں کا اختلاف صرف ایک نہیں دونوں

کے لیے سوہانِ روح ہوتا ہے صرف فرخندہ ہی نہیں بلکہ عزیز میاں بھی دس بیس برس جلتے رہے ہاں جلتے رہے تم سمجھتی ہو صرف عورت جل سکتی ہے صرف عورت ذات نفرت و حقارت کی ٹھوکریں کھاتی ہے میرے گھر سے دیوار بیچ اس کا گھر ہے اور آج چودہ سال سے میں ان کے گھر کا طور طریقہ دیکھ رہی ہوں اور سچ کہتی ہوں۔ بی بی اس بے چارے نے جتنا ظلم اٹھایا ہے کیا کوئی عورت اٹھائے گی۔ فرخندہ خدا کی پناہ کچھ ایسی ویسی عورت ہے تم خود کہتی ہو کہ اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے اور ساتھ ہی مزاج میں وہ غرور اور تمکنت ہے اللہ توبہ اس کے لئے بیچارے عزیز میاں جیسے شوہر کا ملنا انتہائی کوفت کا باعث ہوا لیکن رنج اس کے دل کو نہیں پہنچا تھا فرخندہ جیسی عورتوں کے دل نہیں ہوتا صرف دماغ ہوتا ہے رنج اس کے احساس خودداری کو اس کے غرور کو پہنچا تھا بہرحال جتنا رنج فرخندہ جیسی طبیعت کی عورت کو پہنچ سکتا ہے اس کو پہنچا اور واقعی اس کی شادی بہت بے جوڑ ہوئی لیکن اس میں قصور سراسر اس کے ماموں کا تھا جنہوں نے سوچ کر کہ اپنی چار چار بیٹیاں ہیں فرخندہ کو کنوئیں میں دھکیل دیا لیکن اس کے شوہر کا اس میں اتنا قصور تھا کہ اس نے پیام بھیجنے کی جرأت کی ہمتی اس میں وہ نہیں اس کا باپ ذمہ دار تھا۔ بہرحال فرخندہ سے

شادی کرنے کے جرم میں بائیس برس ذلت کی ٹھوکریں کھائیں خدا اس کی مغفرت کرے۔ آمین

فرخندہ نے جس دن سے اس گھر میں قدم رکھا اس دن سے مرنے کے دن تک کبھی اس کم بخت سے سیدھے منہ بات تک کی۔ نفرت و حقارت کے اظہار کا کوئی ذریعہ اٹھا نہ رکھا گھر اس کا بھلا ہو یا برا اس گھر کا مالک وہی تھا۔ لیکن اس کو رہنے کے لئے کونسی کوٹھڑی دی گئی تھی۔ ڈیوڑھی کے قریب جو اندھیرا سا ایک کمرہ ہے نا میرے یہاں ویسا ہی ٹھیک۔ ایک کمرہ ان کے گھر میں بھی ہے کیونکہ وہ دونوں گھر ایک نقشے پر بنے ہوئے ہیں اس نے شادی کی دوسرے سال ہی جب اس کے والد کا انتقال ہوا ہے، زمینداری کے سارے کاغذات بعینامے وغیرہ بیوی کے حوالے کر دیئے تھے یعنی بیگم صاحبہ مالک و مختار تھیں۔ اسے گاؤں تک میں جانے کی اجازت نہ تھی اس لئے کہ دو چار دفعہ جب وہ گاؤں گیا اس نے فرخندہ کے بغیر اجازت دو ایک غریب کسانوں کو لگان معاف کر دیا تھا تو بیج کے لئے کچھ پیسے کسی کو دے دیئے کچھ قرض دیدیا۔ یہ لوگ اس کی رعایا تھے بچپن سے اس کو جانتے اس کی عزت کرتے تھے وہ ہزار سیدھا تھا احمق تھا لیکن ان کا زمیندار تھا اور

اتنے سے گھر اور آس پاس کے کھیتوں کے مل رہے ہیں۔ میں پورا گاؤں
تھوڑی بیچ رہی ہوں۔ خیر کبھی وہ گاؤں بک کر رہا۔ اس گاؤں کے بکنے نے
عزیز میاں کا دل توڑ دیا بس تب ہی سے جو چارپائی پر پڑے تو مر کر ہی اُٹھے
اگرچہ فرخندہ روکتی تھی گاؤں جانے نہیں دیتی تھی لیکن پھر بھی چھٹے آٹھویں
مہینے ہو آتے تھے اور جب کبھی وہ گاؤں جاتے گویا پھر سے زندگی ہو جاتی تھی۔
ہم لوگوں کے لئے چھپ کر تازہ گڑ کچھ انڈے کچھ ترکاریاں لے کر آتے اور
اس فخر کے ساتھ دیتے کہ گویا دنیا کی دولت ہے۔ یہ میرے گاؤں کے ہیں بیگم
صاحبہ یہ میرے اپنے گاؤں کے ہیں۔ یہ سہارا بھی ظالم فرخندہ نے چھین لیا
تھا تو بیچارے کے لئے دنیا اندھیر ہو گئی۔

لڑکا بھی تو ہے نا ایک۔ ملں ہے تو لیکن وہ تو فرخندہ جیسی ماں کا لڑکا باپ
کو ماں سے بڑھکر حقیر سمجھتا۔ شاید اس نے ایک دفعہ بھی باپ سے سیدھے منہ
بات نہیں کی۔ اسکول کے لڑکے آتے تھے باپ کے کمرے کے دروازے
سے بچاسوں دفعہ کر گزرتا ایک نہیں کئی دفعہ میں نے اپنے کانوں سے
سنا لڑکوں کو پوچھتے یہ کون بیٹھا ہوا ہے اور فرخ یہ کہتے ہوئے جلدی سے
ان کو بہلا لے جاتا میرے ایک گاؤں کا نوکر ہیں۔۔۔ ؟ باپ کیا یہ نہیں سنتا ہوگا اور

اس کے دل پر کیا چھریاں نہیں چلتی ہوں گی۔ میں نے کہا تھا۔

اور مزا تو یہ تھا کہ فرخندہ جب لڑکے پر خفا ہوئیں۔ اور واقعی بہت نالائق نکل رہا ہے پڑھا لکھا کچھ نہیں تو بھی بے چارے شوہر کی شامت آئی۔ ایسے باپ کا لڑکا اور کیا ہو گا باپ کا رعب ہے نہ داب اب کوئی اس خدا کی بندی سے پوچھے کہ اس باپ کا کچھ رعب تو نے ہونے بھی دیا۔ خود باپ جاہل جٹھ تو بیٹا کیا خاک پڑھے گا وغیرہ وغیرہ غرض دل شکنی کا کوئی موقع ایسا نہ تھا جو فرخندہ نے ہاتھ سے جانے دیا ہو۔ خیر بیچارہ اپنے ٹھکانے تو پہنچ گیا اب آرام ہی آرام سے یہ کہتے ہوئے زینت آپا کی آواز بھرا گئی اور وہ چپ ہو گئیں۔ میرے دل پر اس قصے کا بڑا اثر ہوا خاندان میں ہم سب اب تک فرخندہ سے ہی ہمدردی کرتے آتے تھے اگرچہ ان کی زبان اور مزاج کی وجہ سے کوئی بھی ان سے خوش نہ تھا لیکن ہر ایک کو ان سے اس بات پر ہمدردی تھی کہ بیچاری کو شوہر بُرا ملا ہے

آج زینت آپا نے جو تصویر کا دوسرا رخ دکھایا تو میں حیران رہ گئی۔ لیکن ایک دم مجھے خیال آیا کہ زینت آپا تو انہیں اتنا مظلوم بتا رہی ہیں اور میں نے ایک دفعہ یہ بھی تو سنا تھا کہ ان حضرت نے ایک چھوکری یا اور کسی عورت کے ساتھ ...... مجھے اچھی طرح یاد آیا کوئی چار اک سال کا ہی تو واقعہ ہے مجھے

گزشتی ناتمام

تمہارے بھائی نے بتایا تھا۔ تم نے اور کچھ سنا کہ فرخندہ غریب کی بد قسمتی پر بدقسمتی۔
ان کے اس اجڈ شوہر نے ایک ماما گھر ڈال لی تھی۔ بیوی رہتی دیکھیے فرشتہ فرخندہ
جیسی نند بیوی کی اس کم بخت کو کیا قدر ہوتی فرخندہ کو اس واقعہ کا بڑا رنج ہوا
ذلت پر ذلت ایک تو ایسا شوہر اور پھر اس سے بے وفائی کرے۔ وغیرہ وغیرہ۔
نفرت کی ایک لہر اس واقعہ پر خاندان میں دوڑ گئی تھی۔ ہر ایک کو فرخندہ سے
ہمدردی ہو گئی تھی میں نے زینت آپا کو وہ واقعہ یاد دلایا۔ زینت آپا
بولیں میں تب بھی یہی کہوں گی کہ تم لوگوں کو دنیا کا کچھ حال معلوم نہیں بس وہی سنے
سنائے اخباری فقرے دہراتی رہتی ہو۔ میاں کو زندگی سے نکال لیا۔ اُف وہ
بیوی کے لیے سوہانِ روح ذلت انتہائی ذلت شوہر کے ظلم کی حد ہو گئی۔
ہاں تو بات ہے اب سے چار برس پہلے عزیز میاں سے اور سلیمن نامی ایک چھوکری
سے جو انہی کے گاؤں سے فرخندہ لائی تھیں، کچھ تعلقات ہو گئے تھے یہ ایک
غلامی تھی یہ ایک جواب تھا بیس برس کے ظلم بیوی کی ٹھوکروں کا جو عزیز
میاں نے فرخندہ کو دیا تھا۔ پہلا اور آخری موقع تھا کہ عزیز میاں نے فرخندہ
کو جوئے سے نکالنے کی نہیں تو کسی قدر ڈھیلا کرنے کی جرأت کی تھی اور یہاں تو تم سے
کہ انہیں الزام نہیں دے سکتی اور اگر تم سمجھتی ہو کہ ان کا اس چھوکری سے تعلق

تصویر کا دوسرا رخ

کسی قسم کے جذبات کی بنا پر تھا جس کے ماتحت زمیندار عام طور سے ایسی باتیں کیا کرتے ہیں تو یہ تمہاری غلطی ہے۔ عزیز میاں اور اس چھوکری سلیمن کا تعلق ایک دل گرفتہ مظلوم انسان کی ایک انسان سے ہمدردی کی طلب تھی اور کچھ نہیں۔ جس زمانے کا یہ واقعہ ہے۔ عزیز میاں بہت بیمار تھے فرخندہ اس زمانے میں کسی کام کے سلسلے میں دہلی گئی ہوئی تھی پورے چار مہینے تک باہر ہی رہیں دو دفعہ آئیں میاں کو بیمار دیکھا اور پھر چلی گئیں گھر میں سوائے اس چھوکری کے کوئی اور نہ تھا گرمی کا زمانہ تھا ہم لوگ بھی پہاڑ گئے ہوئے تھے یہ چھوکری ان کو پکاتی کھلاتی اور جب بیمار پڑ گئے تو جیسے بھی بن پڑا ان کی تیمارداری کرنے لگی یہ ان کے گاؤں کی چھوکری تھی اس کی نظروں میں وہ مالک تھے زمیندار تھے فرخندہ کے شوہر تھے نوکر جس حقارت کی نظر سے عزیز میاں کو دیکھتے تھے ان کے برخلاف لڑکی انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ تم سوچو اکیلے مکان میں ایک بیمار نہ کوئی پرسان حال نہ تیماردار سوائے ہم لوگوں کے محلے میں کسی اور سے عزیز میاں کی جان پہچان نہیں تھی فرخندہ نے بھی انہیں کہیں آنے جانے نہیں دیا۔ اس سے اس کی ذلت ہوتی تھی اس لئے انہیں کوئی پوچھنے والا نہ تھا جو کچھ تھی۔ لے دے کے وہی گنوار سادہ، پرخلوص لڑکی تھی۔ اس لڑکی نے انہیں سب کچھ دیا جو بیوی سے انہیں نہیں ملا تھا عزیز میاں ہمدردی محبت عزت کے کتنے بھوکے تھے اس کا اندازہ تم نہیں کرسکتیں، بیوی لڑکا دھن دولت مکان

کوششِ ناتمام

سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ان کا کچھ نہ تھا۔ وہ تنہا تھے وہ مفلس تھے وہ بیمار تھے وہ لاوارث
تھے۔ ایسے میں اس لڑکی نے ان کا ہاتھ تھام لیا اور گرتے ہوئے اگر انہوں نے اس کا
سہارا لیا تو کیا برا کیا؟ بیس برس کا رکا ہوا دھارا بہہ نکلا لبریز پیمانہ چھلک گیا۔ دنیا
کے لعن طعن، بیوی کے مظالم اور خود اپنے لڑکے اور نوکروں کی تحقیر سے ان کو اس غریب
اور بھولی بھالی لڑکی کے دامن میں نجات ملی اور انہوں نے اس میں پناہ لی تو ایسا کونسا گناہ کیا؟ انصاف
کہنا کیا وہ اس گناہ کی سزا میں ان کو اور کیا دے سکتی تھی ویسے ہی نوکر کی اوقات تھی ہاں
چھوکری غریب پر فرخندہ نے وہ ظلم توڑے کہ توبہ بھلی۔ چھ دن تک اندھیری کوٹھری میں بھوکی
پیاسی بند رکھا۔ مارتے مارتے ادھموا کر دیا۔ ادھر میاں کی مجال نہ تھی کہ اس کی طرفداری میں ایک لفظ کہتے۔ تو سچ تو یہ
ان کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ مگر شاباش ہے بی فرخندہ کو ساری دنیا میں ڈھنڈورہ پیٹ دیا کہ بدمعاش
میاں نے چھوکری گھر میں ڈال لی ہے۔ بیوی پر ظلم کی حد کر دی ہے ہر آتا فرخندہ کے آنسو پونچھتا اور
میاں پر تھوکتا۔ اس بیچارے نے اف تک نہ کی۔ ہائے رے اس کی مسکینی اور بےچارگی! اچھا ہی
ہوا دنیا سے چھٹکارا مل گیا۔ قبر میں کچھ نہ ملے چین تو ملے گا۔" یہ کہتے کہتے زینت آپا کی آواز بھرا گئی
اور مجھے بھی ایسا معلوم ہوا جیسے آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا ہے۔ شام ہو چکی تھی
اسلئے میں گھر جانے کے لئے اٹھی۔ تمام راستہ یہی خیال رہا کہ دنیا ایک بھید ہے۔ ایک معمہ ہے ہم سمجھتے
کچھ ہیں نکلتا کچھ ہے۔ سچ ہے ؎ نہ سمجھا درد ہم نے بھید یاں کی شادی و غم کا
سحر خنداں ہے کیوں روتی ہے کس کو یاد کر شبنم

"نصف بہتر"

"شیلا تمہارا دھیان کہاں ہے۔ کیا سوچ رہی ہو؟" شیلا یہ سن کر چونک سی پڑی۔ "کچھ نہیں استانی جی" یہ کہہ کر شیکسپیئر کے تصور میں سیزر کے کیریکٹر پہ استانی کا سبق غور سے سننے لگی۔ لیکن اگرچہ وہ بظاہر متوجہ تھی لیکن دل کی کیفیت اور تھی۔ استانی ایک نہایت قابل ٹیچر تھی۔ طالبعلم سے کی طبیعت سے اس کو پوری پوری واقفیت تھی۔ شیلا کا یوں بددلی پڑھنا غیر معمولی بات تھی اس لئے اس نے سبق کو مختصر کر کے ختم کر دیا۔ اور کہا "بتاؤ شیلا تم آج کل ایسی کھوئی کھوئی کیوں رہتی ہو؟" شیلا نے نظریں نیچی کر لیں اور اس کے رخسار سرخ ہو گئے۔ استانی سمجھ گئی کہ شادی بیاہ کا ذکر

ہو رہا ہوگا۔" اچھا یہ بتاؤ شیلا کب اور کس سے؟" "میرے بی۔ اے کے امتحان کے بعد۔ اے۔ اے مس مس۔ڈ۔ نریندر کمار سے۔" شیلا نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کون مسٹر نریندر کمار؟" استانی نے چونک کر پوچھا۔ "وہی تو نہیں جو تمہارے بڑے بھائی کے ساتھ اکثر آتے ہیں؟"

"جی وہی" شیلا نے جواب دیا۔ استانی یہ سن کر خاموش ہو گئی۔ اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ کسی گہرے سوچ میں ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا "کیوں شیلا وہ تمہیں پسند ہیں؟" شیلا پھر شرما گئی اور جواب دیا۔ "شیلا تمہیں مجھ سے شرمانے کی ضرورت نہیں۔ سچ بتاؤ تمہیں نریندر کمار پسند ہیں؟"

"ام۔ ہیں۔ جی ہاں" شیلا نے کہا۔ "وہ بی۔ اے آنرز ہیں۔" "جی نہیں آنرز تو نہیں ایسے ہی بی۔ اے ہیں۔" اور کرتے کیا ہیں؟" "جی کسی فرم میں نوکر ہیں۔ بیرسٹر ہیں پھر بیرسٹری چھوڑ دی اور کسی تجارتی فرم میں نوکری کر لی ہے۔"

"بیرسٹری کیوں نہیں کی؟" "پتہ نہیں" شیلا نے کہا۔

"پر شیلا تم تو بڑی چلبلی ہو۔ وہ بخاموش طبیعت کے معلوم ہوتے ہیں۔"

"جی ہاں" "بالکل خاموش طبیعت کے۔ بھائیجان وغیرہ انہیں اس قدر چھیڑتے

ہیں، ستاتے ہیں۔ بحث میں ہمیشہ بیچارے کو قائل کر دیتے ہیں۔ اور ان سے کچھ کہتے نہیں بنتا۔ مجھے افسوس اتنا ہوتا ہے۔ ایسی طبیعت کا آدمی بے چارا کتنی تکلیفیں اٹھاتا ہوگا۔ اسے کتنا رنج ہوتا ہوگا۔ جب میں۔ میری۔ ہماری کہہ کر شیلا پھر شرما گئی۔

"ہاں کہو جب تمہاری شادی ہو جائے گی تو کیا کرو گی؟" جی میں سب کو ان کی طرف سے جواب دوں گی۔ ایسا قائل کروں گی کہ وہ بھی یاد کریں گے کیوں استانی جی آپ ہمیشہ کہتی ہیں میں دو آدمیوں کے برابر باتیں کرتی ہوں پھر اب تو ٹھیک رہے گا مجھ کو دو آدمیوں کی طرف سے باتیں کرنی پڑیں گی۔" شریر شیلا کی آنکھیں شرارت سے چمکنے لگیں

استانی نے مسکرا کر کہا۔ "ہاں ٹھیک ہے خدا تمہیں خوش رکھے" یہ کہہ کر وہ جلدی سے اٹھ گئی اور وقت سے پہلے سبق ختم کر دیا۔

دوسرے دن وہ سویرے آئی۔ جاڑوں کی دوپہر کو شیلا کی والدہ صحن میں بیٹھی پڑھتی یا چھالیا کترتی ہوتی تھیں۔ استانی جی ان کے تخت کے آگے جا کر کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "آہا! استانی جی آئیے بیٹھئے۔" اور تخت پر سرک کر جگہ دی۔ تین ساڑھے [illegible] سال سے وہ شیلا کو پڑھاتی

تھی لیکن اس عرصہ میں سردارنی صاحبہ کی مسلسل کوشش کے باوجود ان لوگوں سے بہت ہی الگ تھلگ رہتی تھی۔ نہایت خاموش افسردہ طبیعت کی آدمی تھی۔ سردارنی جی جو زندہ دل خوش باش عورت تھیں چاہتی تھیں کہ استانی ان سے گھل مل کر باتیں کرنے لگیں۔ اور کوئی زیادہ آنے جانے والا اس گاؤں میں نہیں تھا۔ کہ ان کا دل بہلتا بعض دفعہ ان کا دل چاہتا تھا کہ شیلا کے لئے کوئی اور استانی رکھیں۔ لیکن یہ پڑھانے کے لحاظ سے اتنی اچھی تھی اور شیلا اس کو باوجود اس کے خشک مزاج ہونے کے اس قدر چاہنے لگی تھی کہ اس کو انہوں نے بدلا نہیں تھا۔ اس لئے استانی کو خود سے آکر بیٹھتے دیکھ کر انہیں تعجب ہوا لیکن انہوں نے اسے دیکھتے ہی باتونیوں کی طرح باتوں کا سلسلہ شروع کر دیا "کہو ٹیچر جی۔ تمہاری لڑکی کیسی ہے۔ بڑا لڑکا جو لاہور میں پڑھ رہا ہے اس کی چھٹیاں کب ہوں گی؟ مجھے بچوں کو کیسے پڑھاتی ہو اور پھر گھر کا کام بھی اور روزانہ شیلا کو ڈھائی گھنٹے پڑھانا۔ واقعی تم بڑی کمال کی آدمی ہو" استانی نے ان کے سوالات کا جواب دینے کے بعد فوراً ہی پوچھا "سنتی ہوں شیلا کی نسبت ٹھہر گئی ہے"۔ "ہاں ٹیچر جی میں تم سے کہنے ہی والی تھی۔ میں تو چاہتی تھی اب کے گرمیوں میں شادی ہو جاتی لیکن سردار صاحب لڑکی کے پڑھنے کا شوق دیکھ کر

کہتے ہیں کہ بی - اے کا امتحان کرے تو۔"

"یہ نریندر کمار بابو تو ایسے ہی معمولی پڑھے لکھے ہیں نا؟"

"ارے جی نہیں تیجر جی - بی - اے ہیں - بیرسٹر ہیں - بیرسٹری تم جانو آجکل کسی کی چلتی نہیں اس لئے نوکر ہو گئے ہیں - چار سو تنخواہ ملتی ہے - اس زمانہ کے لئے غنیمت ہے اس پر سردار صاحب کے ذریعہ امید ہے اور ترقی ہو گی۔"

استانی چند منٹ خاموش رہی پھر اس نے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا۔

"سردارنی صاحبہ مجھ کو شیلا کو پڑھاتے ہوئے تقریباً ساڑھے تین سال ہوئے - مجھ کو اس لڑکی سے بے حد محبت ہو گئی ہے - اور آپ سب کی مہربانی کا بھی میرے دل میں بہت گہرا اثر ہے - میں نے آجتک آپ لوگوں کی عنایت کا جواب جس طرح دینا چاہئے نہیں دیا - کیونکہ مجھ کو زندگی کا ایسا تلخ تجربہ ہوا ہے کہ میں اب تعلقات میں رنگینی اور زندگی پیدا کرنے سے ڈرنے لگی ہوں - لیکن باوجود اس کے شیلا سے مجھ کو اتنی محبت ہو گئی ہے کہ آج برسوں کے بعد میں پھر جذبات کو اپنی زندگی میں دخل دینے دے رہی ہوں۔

کوششِ ناتمام

"مسز رانی صاحبہ میں انیس برس کی تھی جب میری شادی ہوئی۔ میں نے اسی سال پنجاب یونیورسٹی سے بی اے آنرز کے ساتھ پاس کیا تھا۔ جس آدمی سے میں نے شادی کی وہ اس کالج میں جس میں کہ میں پڑھتی تھی۔ اسٹوڈنٹ تھا۔ جب میں بی۔ اے میں تھی وہ بی۔ ٹی کر رہا تھا۔ نہایت خاموش کم سخن لڑکا تھا۔ دوسرے لڑکے اس کا مذاق اڑایا کرتے۔ اس کو تنگ کرتے لیکن وہ ان کا جواب دینے یا ان سے بدلہ لینے کی کوشش نہ کرتا تھا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا وہ جواب دیتا بھی لیکن اس میں وہ خود اعتمادی اور ہمت نہ تھی جو کہ دوسروں کے دل میں عزت پیدا کرتی ہے۔ اس کے جواب سے وہ خود ہی الٹا خفیف ہو جاتا تھا۔"

"میں کالج میں بے حد ہر دلعزیز تھی۔ ڈبیٹنگ کلب میں میری خاصی شہرت تھی میرے مضمون پروفیسر تمام کالج کو سنایا کرتے تھے۔ میرا دل محبت کے جذبے اور میرا دماغ خیالات سے بھرا تھا۔ مجھ کو شوہر پر بڑا رحم آتا تھا۔ بیچارہ اس قدر اچھی طبیعت کا آدمی ہے اور یہ لڑکے کیسے درندے ہیں۔ اسے تنگ کرتے ہیں۔ متضاد طبیعتیں ایک دوسرے کی طرف کھنچتی ہیں۔ بہرحال میں شوہر پر بہت مائل ہونے لگی۔ ادھر شوہر نے بھی مجھ سے والہانہ محبت کرنی شروع

کی۔ کالج میں سب کو میرے نزدیک یہ بڑا تعجب ہو رہا تھا۔ میں اس زمانہ میں خوبصورت تھی۔ بذلہ سنج، حاضر جواب، زندہ دل، سارا کالج میرے گیت گاتا تھا۔ اس زمانہ میں لڑکیاں کالج میں بہت کم ہوتی تھیں اس لئے اور بھی زیادہ قدر تھی۔ سب کو تعجب تھا کہ میں نے کالج بھر کے سب سے "ڈل" آدمی کو کیوں منتخب کیا تھا۔ میں نے اس لئے اسے منتخب کیا تھا کہ مجھ کو اس پہ بے حد رحم آتا تھا۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ وہ میری عزت اور قدر اور زیادہ کرے گا۔ اس کے دل میں میری محبت ان لوگوں سے زیادہ ہوگی جو کہ خود بھی زندہ دل، بذلہ سنج، حاضر جواب ہیں اور میری محبت دوسروں کی سرد مہری کی تلافی کر دے گی۔ مجھے پا کر اس میں خود اعتمادی پیدا ہو جائے گی۔ میں نے تفصیلاً یہ ساری باتیں سوچی نہیں تھیں۔ لیکن میرے دل میں ضرور یہ خیالات ہوں گے۔

بہر حال ہماری شادی ہو گئی۔ اسے ایک اسکول میں پانسو روپے کی نوکری مل گئی تھی اور مجھے پاس ہوتے ہی میرے کالج نے دوسو پہ لکچرار مقرر کر دیا تھا۔ ہماری شادی ستمبر میں ہوئی تھی اس وقت کالج کی چھٹیاں تھیں۔ اکتوبر میں جب کالج کھلا ہے تو شوہر نے میرا نوکری پہ واپس جانا پسند نہیں کیا۔ حالانکہ شادی سے پہلے اس نے میری نوکری پہ کوئی اعتراض نہ کیا تھا لیکن شادی کے بعد اس

کے حساس جذبات کو اس بات سے ٹھیس لگی تھی کہ کسی نے مذاقاً مجھے اس کا
"نصف بہتر" کہہ دیا تھا جس پر دوسرے دوست نے کہا تھا "ہاں ہر لحاظ سے
نصف بہتر" میاں کو تو پونے دو سو ملتے ہیں لیکن بیوی کو پورے دو دیڑھ سو۔ یہ
جملہ اس کے دل میں اتر گیا اور اس نے میری نوکری اس بنا پر چھڑوا دی۔
مجھے اس سے بے حد محبت تھی۔ میں نے خوشی سے اس کا کہنا مان لیا۔
مجھے افسوس تو ہوا لیکن زیادہ نہیں۔ میں ہمہ تن گھر کے کام میں منہمک ہو گئی
جیسا کہ کالج کی لڑکیوں کا دستور رہا ہے۔ مجھے بھی کھانا پکانا خانہ داری کی
باتوں کا مطلق علم نہ تھا۔ میں نے ان کو بڑے انہماک سے سیکھنا شروع کیا۔ میری
طبیعت ہمیشہ ہر چیز میں اول رہتی آئی تھی۔ میں نے سوچا کہ خانہ داری میں کیوں
پیچھے رہوں۔ چند مہینے خوشی خوشی اس طرح نکل گئے۔ کچھ دنوں کے بعد میرا
بڑا لڑکا پیدا ہوا۔ اور اس کی پرورش میں مشغول ہو گئی۔ میں خانہ داری کی طرح
بچوں کی پرورش کے طریقے سے بھی ناواقف تھی۔ لیکن میں نے جب سے مجھے یہ
معلوم ہوا کہ میرے یہاں بچہ ہونے والا ہے کتابیں پڑھنی شروع کی تھیں اور
جگدیش کے پیدا ہونے کے قبل ہی سارے اصولوں سے واقف ہو گئی تھی
دن نکلتے گئے جگدیش دو برس کا ہو گیا اب میرے پاس بہت وقت تھا گھر کا کام

کالج میں منٹوں میں کر لیتی تھی۔ بچپن ہی سے ایسی اچھی طبیعت کا تھا کہ گھنٹوں اکیلے کھیلتا رہتا تھا۔ میرا دل بیکاری سے گھبرانے لگا۔ میں نے ایم۔ اے کی کتابیں منگا کر پڑھنا شروع کیں۔ شودھیر نے سنا تو اس کی بھی مخالفت کی۔ "تم پڑھتی رہو گی تو جگدیش کی طرف غفلت ہونا لازمی ہے" میں نے کہا "میں جگدیش کے سونے کے اوقات میں پڑھتی ہوں" بہرحال اسی سال بھر میں ایم اے کا امتحان دیا اور یونیورسٹی میں اوّل آئی۔ میں نے امتحان بالکل پرائیویٹ طور پر دیا تھا۔ مجھ کو خود اپنی کامیابی پہ تعجب ہوا۔ میرے پرانے پروفیسر اور ساتھ کے سٹوڈنٹس پھر میرا پتہ لگنے سے بہت خوش ہوئے۔ مبارکباد اور تہنیت کے خط اور تاروں کا سلسلہ بندھ گیا۔ اخباروں میں بڑی تعریف چھپی لیکن شودھیر نے کسی خاص خوشی کا اظہار نہیں کیا اور صرف یہ کہا کہ یہ فضول وقت اور پیسے کی بربادی ہے۔ حالانکہ سوائے یونیورسٹی کی فیس کے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوا تھا۔ مجھ کو یونیورسٹی میں اوّل آنے کی وجہ سے ولایت جا کر تین سال تعلیم پانے کا سکالرشپ ملا۔ میری آنکھیں کھل گئیں۔ جب میں نے ایم۔ اے کا امتحان دیا تھا اس وقت میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ مجھے سکالرشپ ملے گی۔ میرا تو خیال تھا کہ شاید پاس بھی مشکل ہی سے

ہو سکوں گی لیکن سکالرشپ کو پا کر دل چاہنے لگا کہ اس کا فائدہ اٹھاؤں شوہر نے سختی سے میرے انگلستان جانے کی مخالفت کی گو بظاہر اس نے جگدیش کو وجہ بنایا لیکن حقیقت میں وہ میری شہرت اور کامیابی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اب چار سال بعد یہ احساس ہو رہا تھا کہ میرا شوہر مجھ سے حسد کرتا ہے۔ اس نے رفتہ رفتہ ان لوگوں کا آنا جانا کم کرتے کرتے بالکل ہی بند کر دیا تھا۔ جو مجھے جانتے تھے۔ جن سے علمی گفتگو ہوتی تھی۔ جو کہ خود بذلہ سنج اور حاضر جواب تھے اور دوسروں کی حاضر جوابی کے قدردان تھے کیونکہ ایسے لوگوں میں خود کو کمتر محسوس کرتا تھا۔ میرے ملنے والے اب نہایت ہی کند دماغ کلرک اور سکول ماسٹر اور ان کی بیویاں تھیں۔ وہ میرے مطالعہ پر بھی ناک بھوں چڑھاتا تھا۔ "آخر شادی کے بعد تم کیوں پڑھے جاتی ہو؟" اس کا کہنا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میرا دماغ کسی طرح بالکل ماؤف ہو جائے معلوم نہیں اس نے ایم۔ اے مجھے کیوں کرنے دیا۔ شاید اس امید پر کہ میں فیل ہو جاؤں۔ اگر میں فیل ہو جاتی تو اس کے مجروح احساس خودداری کو بڑا سکون ہوتا۔ کاش کہ میں فیل ہو جاتی۔"

سرور نے دیکھا کہ استانی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس کے لب

کانپ رہے تھے۔ اس کا ننھا چہرہ احساسِ جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔

"مسز ارانی صاحبہ معاف کیجئے میں آپ کی سمع خراشی کر رہی ہوں لیکن یہ سب کچھ میں شیلا کے لئے کر رہی ہوں۔

"ہاں! تو شودھیر نے میرا اسکالرشپ واپس کروا دیا۔ میں نے کہا کہ انگلستان میں جگدیش کی عمر کے بچے کے لئے نہایت اعلیٰ ہوسٹل ہیں اسے وہاں رکھ کر پڑھ سکتی ہوں۔ اور وہاں یونیورسٹی کی پڑھائی کا زمانہ صرف سال میں پانچ مہینے باقی وقت میں جگدیش کے پاس گزاروں گی بلکہ ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں ہندوستان آجاؤں گی کیونکہ تمام غریب اسٹوڈنٹس یہی کرتے ہیں ولایت میں رہنے کی نسبت یہ زیادہ سستا ہوتا ہے اور چونکہ میں ایم۔ اے ہوں اس لئے میں تین کے بدلے صرف دو سال میں ہی ڈگری لے سکتی ہوں۔ لیکن شودھیر نے ایک نہ سنی اور میرا اسکالرشپ ایک تیسرے درجے کی پاس ایم۔ اے کو دے دیا گیا اور میں ہاتھ ملتی رہ گئی۔

اب میری زندگی کا بہت پریشان زمانہ شروع ہوا۔ علمی مشاغل کی طرف دیکھنے کو وقت نہیں رہا اور بہت جلد جلد چار بچے ہوئے۔ حالانکہ میں

کوششِ ناتمام

ناقابل نہ تھی کہ اتنے بچوں کی کفالت کو کافی ہوتی لیکن شوہر کو مجھے بے دست و پا و ہراساں و پریشاں رکھنا مقصود تھا تاکہ میرا دل اور دماغ چور اور شکستہ ہو جائے اور وہ واقعی چار چھ سال میرے ایسے برے گزرے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ پونے دو سو روپیہ ماہوار کی آمدنی اور پانچ بچوں کی پرورش اور لاہور شہر کا رہنا لیکن وہ کسی صورت میں بھی میرے نوکری کرنے پر یا پرچہ وغیرہ جاری کر کے آمدنی بڑھانے کے لئے رضامند نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ اس سے میری انفرادیت قائم رہتی تھی۔ اب میرا دل شوہر کی طرف سے مکدر ہو چلا تھا لیکن وہ محبت جو کہ مجھے اس سے تھی اب بھی باقی تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ اب بھی مجھ سے محبت کرتا تھا لیکن اس کی محبت سے زیادہ اس کے حسد کا جذبہ تھا اس کو احساس کمتری تھا اس کو خوف تھا کہ اگر اس نے مجھے ترقی کرنے دی تو میں اسے چھوڑ دوں گی۔ حالانکہ اگر وہ مجھے کامیاب ہونے دیتا، میرے دماغ کو ماؤف اور مجھے بے دست و پا کرنے کی کوشش نہ کرتا تو میری محبت کا درخت کبھی خشک نہ ہوتا۔ ادھر میں ہزار چاہتی تھی کہ علمی دلچسپی سے بالکل ہی کنارہ کش ہو جاؤں لیکن میری طبیعت اسے منظور نہ کرتی تھی۔ ہم دونوں اپنی اپنی فطرت سے مجبور تھے۔

نصف بہتر

علم کی چاہت، شہرت کی تمنا، دماغی سرگرمی کی خواہش تو میں نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ گرچہ ان چھ سالوں میں تو میں تقریباً بالکل ہی ان باتوں سے بیگانہ رہی لیکن جب میرے چھوٹے لڑکے کی عمر تین سال کی ہو گئی اس وقت ہندوستان میں ایک سیاسی ہیجان اور سرگرمی کا دور دورہ تھا۔ جاہل اور پردہ نشین عورتیں تک اس میں حصہ لے رہی تھیں۔ میرے کالج کی تمام لڑکیاں بڑی سرگرمی سے اس میں حصہ لے رہی تھیں ان میں سے ایک سے میری اتفاقیہ ملاقات ہو گئی اور اس نے مجھ کو بہت شرمندہ کیا کہ ایسے وقت میں میں اپنے ملک اور قوم کے لئے کچھ نہیں کر رہی ہوں۔ مجھ کو اب پھر کسی قدر فرصت تھی۔ تین بچے اسکول چلے جاتے تھے۔ چھوٹا لڑکا بھی تین سال کا ہو چکا تھا۔ میں بھی کاموں میں شامل ہو گئی۔ اور بہت جلد میری انتظامی قابلیت اور میری تقریروں کی شہرت ہونے لگی۔ شوہر نے حسبِ معمول میرے راستے میں روڑے اٹکانے کی کوشش کی لیکن اب مجھے شوہر کے کہنے کی پرواہ نہیں تھی۔ اس کے علاوہ چھ سال کی زندگی نے مجھ کو بیزار کر دیا تھا۔ میرا دل اور دماغ ایسے کام کے لئے تشنہ تھا جس میں کہ ذہنی قوتیں استعمال میں آ سکیں۔ لیکن یہاں بھی مجھے شکست ہوئی۔

کوشش ناتمام

میری شہرت دو ڈھائی سال کے اندر اندر تمام ہندوستان میں
پھیل چکی تھی۔ اکابرین کانگریس مجھ سے واقف ہو چکے تھے اور میرے
بے حد قدردان۔ مردم شناس نگاہیں مجھے ہندوستان کی آئندہ سیاست
میں ایک اہم جگہ دے چکی تھیں۔ غرض میرا مستقبل بہت شاندار تھا
لیکن یہ بھلا شوہر کو کیسے گوارا ہوتا جس شخص کی تنگ نظری نے میرے
پچیس روپے زیادہ تنخواہ پانا تو گوارا نہ کیا تھا وہ یہ کس طرح گوارا کرتا کہ
وہ ہنوز ایک معمولی سا اسکول ماسٹر ہو اور میں آسمانِ سیاست پر تارے
کی طرح چمکوں۔

اس دفعہ اس نے قطعی اور مکمل ترکیب مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے علمی
اور عملی دنیا سے الگ کرنے کی سوچی۔ اس نے کہنا شروع کیا کہ شہر میں اس
کی صحت اچھی نہیں رہتی دوسرے شہر میں رہنا بہت زیادہ گراں پڑتا ہے
بہتر ہے کہ ہم سب کسی چھوٹے سے دیہات میں جائیں۔ اس نے کوشش
کر کے اس چھوٹے سے گاؤں کے اسکول میں اپنا تبادلہ کرا لیا اور آج
دس گیارہ سال سے ہم لوگ یہاں ہیں

میری طبیعت کی عورت کے لئے یہ گاؤں زندہ قبر ہے۔ عورت تو عورت

یہاں کوئی مرد بھی نہیں جس نے کبھی اس گاؤں سے باہر کی دنیا کی ایک جھلک بھی دیکھی ہو جو کہ میرے خیالات سے اتفاق کرنا تو درکنار ان کو سمجھ بھی سکے لیکن اب مجھ میں جدوجہد کی طاقت باقی نہیں۔ میں نے اپنی شکست مان لی ہے۔ میں نے اپنے ارمان اپنی تمنائیں اپنی۔۔۔ آرزوئیں سب دفن کر دیں ہیں۔ اب میری زندگی ایک زندہ لاش ہے۔"

اس کے بعد استانی کچھ ٹھہر گئی اور پھر کہا "مسز ارنی صاحبہ آپ تعجب کریں گی کہ اس ساری رام کہانی سے سوشیلا کا کیا تعلق ہے مسز ارنی صاحبہ میں نے نریندر کمار کو دیکھا ہے۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔ وہ بالکل اس قسم کے آدمی ہیں جیسے شودھیر۔ اور سشیلا چنچل، شوخ حوصلہ مند سشیلا بالکل ویسی ہے جیسی کہ میں تھی۔ آپ کے لئے یہ یقین کرنا مشکل ہوگا لیکن مسز ارنی صاحبہ یقین کیجئے میں ایسی ہی تھی۔"

" اور خدا نہ کرے اگر سشیلا کی شادی نریندر کمار سے ہوئی تو وہ بھی ایسی ہی ہو جائے گی جیسی میں۔ نریندر میں بہت سخت احساسِ کمتری ہے۔ میں نے اس کو پچاسوں دفعہ آپ کے لڑکوں سے باتیں کرتے دیکھا ہے۔ ان کے ہنسی مذاق سے وہ اسی طرح جھینپتا ہے جیسے شودھیر کالج میں۔ وہ بیرسٹری میں کامیاب

نہ ہو سکا۔ اس کی ندامت اس کے دل سے کبھی نہیں جائے گی۔ مسز وارمنا حب کے ذریعہ سے ترقی کرنے سے یہ احساس اور بھی زیادہ طاقت پائے گا کم نہیں ہوگا۔ اور یہ تنگ نظر کم حوصلہ اور خود اعتمادی سے عاری انسان شیلا کو بھی اپنی سطح پر لا کر چھوڑے گا۔ مسز وارنی صاحبہ شیلا جیسی لڑکی کو بہ دوں کی کمی نہیں۔ خدا کے لئے اس کی زندگی برباد نہ کیجئے۔"

یہ کہہ کر استانی نے جلدی سے اپنی پرانی سی چھتری اور فرسودہ سا بیگ اٹھایا اور نمستے کہہ کر باہر نکل گئی۔

دو پھول ساتھ نکلے

نعیم نے ایک دفعہ پھر تصویر کو لفافے میں سے نکال کر غور سے دیکھنا شروع کیا۔ تصویر کوئی سات آٹھ مہینے کے بچہ کی تھی۔ بچہ ایک پلے پن کے اندر تھا جس میں ایک قالین بچھا ہوا تھا اس کے اندر کئی کھلونے پڑے ہوئے تھے۔ بچہ ایک ہاتھ سے پن کو پکڑے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نعیم اس تصویر کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

تصویر اس کے بھائی کی تھی۔ ہاں اس کے بھائی کی۔ سستی سی دھاری دار قمیص اور بدرنگ سی نکر پہنے ایک چھوٹے سے مکان کے تنگ دالان میں تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اس قسم کے کھلونوں کی تصاویر جیسے کہ پن میں پڑے ہوئے تھے

کسی انگریزی رسالے میں دیکھی تھیں۔ ایسے کھلونے اسے چھونے تک تو کیا کبھی دیکھنے کا بھی موقعہ نہ ملا تھا۔

نعیم اس تصویر کو دیر تک دیکھتا رہا۔ اس کو گذشتہ جاڑوں کا دن یاد آگیا۔ جب تین سال کے بعد اس کا باپ دہلی آیا تھا۔ اور اپنی نئی نویلی بیوی کو دکھانے کے لئے نعیم اور نصیر اور ساجدہ کو لے گیا تھا نعیم تین سال پہلے کی ملاقات یاد کرکے اب بھی شرم سے پسینہ پسینہ ہو جاتا تھا کیونکہ ان کی غربت اور افلاس ان کے گنوارپن کا مقابلہ بڑے بے رحمی اور بے دردی کے ساتھ ان کے باپ کی بیوی کے تمول، نازک مزاجی اور حسن سے ہوا تھا۔

نعیم کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی لیکن جیسا کہ بن ماں کے بچوں میں اکثر دیکھا گیا ہے عقل اور سمجھ اور مادہ احساس حد سے زیادہ تھا۔ اس کی ماں کو مرے ہوئے تقریباً چار سال ہوئے تھے۔ ماں کی شکل اس کو آج تک یاد تھی۔ باپ نے ماں کے مرنے کے بعد ایک نیم بنگالی، نیم فرانسیسی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ نعیمہ معمولی تعلیم یافتہ خاموش طبیعت سادہ مزاج نعیمہ بے شک ساجد حسین آئی۔سی۔ایس کے قابل نہ تھی۔ ولایت سے آنے کے بعد ساجد حسین برابر محسوس کرتے رہے کہ نعیمہ ان کے دوستوں کے ساتھ ٹینس

اور برج کھیل سکتی تھی اور نہ ہلکے ہلکے مصنوعی قہقہے لگا سکتی تھی۔ اس کے بال سیدھے طریقے سے بندھے رہتے تھے۔ وہ ان میں لا دیزہ چھلے نہیں ڈال سکتی تھی۔ قیمتی کپڑوں میں بھی اس میں کشش نہ تھی۔ غرض ایک آئی سی ایس کی رونق خانہ ہونے کی اہلیت اس میں قطعی نہ تھی۔ مگر یہ بات ساجد بھول چکے تھے کہ نعیمہ ہی کے زیور کی بدولت چار برس وہ ولایت میں رہ سکے اور تعلیم حاصل کی۔ یہ ذرا سی بات ان کے ذہن سے اتر گئی تھی۔ اور ایسے ہو بھی تو گئے تھے کئی سال نعیمہ کے اجڈ پن میں مطلق فرق نہ آیا ۔ لیکن غریب نعیمہ نے بہت جلد مسٹر ساجد کو آزاد کر دیا۔ ساجدہ کی پیدائش کے بعد اس نے قطعی احتیاط نہ کی۔ جاڑوں کے دن تھے۔ صبح زکام ہوا اور تیسرے پہر نمونیہ اور رات کو بائیس دن کی ساجدہ اور دو اور چھوٹے لڑکوں کو چھوڑ کر وہ دوسری دنیا میں چل بسی۔

ساجد صاحب کو نعیمہ کے مرنے کا صرف اس خیال کے کسی قدر رنج ہوا کہ گیارہ برس کا ساتھ چھوٹ گیا۔ لیکن بچوں کو ماں کے پاس دہلی چھوڑا اور ملازمت پر روانہ ہو گئے۔ چند ماہ بعد کلکتہ کا تبادلہ ہو گیا تو اس دلفریب شہر نے بہت جلد نعیمہ کی یاد دل سے بھلا دی۔ ہر طرف سے ان پر نظر کرم تھی ایک نو آئی سی ایس پھر بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ ان کی شادی ہوئی تھی اور بچے موجود ہیں۔ ان

لوگوں میں جو ان پر خاص طور سے مہربان تھے مس اینی رسے کا نمبر سب سے اول تھا۔ چھبیس سالہ حسینہ پیرس کی تعلیم یافتہ تھی۔ اس کی ماں فرانسیسی تھی اور باپ بنگالی۔ حسن پیرس اور حسن بنگال کی یکجائی۔ شراب اور وہ بھی دو آتشہ حسن تھا اور حسن کے ساتھ ادائیں تھیں غمزے تھے، عشوے تھے۔ نزاکت تھی، رعنائی تھی۔ غرض ہر چیز تھی جو نعیمہ میں تھی۔ اور جن کے پانے کا خیال بھی مسٹر ساجد کے دل میں نہ رہا تھا۔ ملاقات کے تین مہینے بعد ہی ساجد صاحب کی منگنی اس سے ہوگئی۔ تین بچوں کے باپ نے نئے نویلے منگیتر کا پارٹ بڑی خوبی سے ادا کیا۔ اور منگنی ہوئی اور چند ہفتوں بعد شادی۔ شادی کے بعد ایام عروسی کشمیر جنت نظیر کی سرزمین پر منائے گئے۔ شادی کی شرط یہ تھی کہ ساجد بچوں کو کبھی اپنے پاس نہ بلائے گا۔ اور نہ ساتھ رکھے گا۔ ایسی حسین دلہن پا کر بچوں کی یاد کس کو رہتی ہے۔ ساجد نے بڑی خندہ پیشانی سے شرط منظور کر لی۔ اور ٹھیک تو ہے بھلا شاخِ گل سے نازک تر رینی تین بچوں کی دیکھ بھال کا بوجھ تھوڑی اٹھا سکتی تھی اور وہ دادی کے پاس اچھی طرح سے تھے باپ ہر مہینے پچاس روپیہ ان کے خرچ کو بھیج دیتا تھا۔ اپنے فرائض سے غافل تھوڑی تھا۔

بنک سے پچاس روپیہ مہینے کے مہینے آجاتے تھے۔ اس کے سوا بڑھیا

ماں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساجد سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جب نعیمہ زندہ تھی تو ساجد ہر سال دہلی آتے تھے اور ماں کے پاس ٹھہرتے تھے لیکن اس کے مرنے کے بعد بچوں کو پہنچا کر جو گئے تو تین سال ہو گئے آنے کا نام ہی نہ لیا۔ تیسرے سال رہینی اور وہ موٹر لورکو نکلے کلکتہ سے پشاور تک موٹر سے سیر کی۔ دہلی بھی پانچ دن ٹھہرے اور اسی دوران میں نعیم، نصیر اور ساجدہ کو اپنی نئی ماں۔ نہیں ایسی عورتیں مائیں کب کہلائی جا سکتی ہیں۔ اپنے باپ کی نئی بیوی کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔

دادی نے نعیم سے دو روز پہلے کہا تھا۔ بیٹا تمہارے ابا دہلی آنے والے ہیں نعیم کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ تین سال ہو چکے تھے مگر اس کو اپنا باپ اچھی طرح یاد تھا۔ ابا اب آئیں گے۔ میں انہیں اپنی کتابیں دکھاؤں گا۔ میں چوتھی میں ہوں۔ میرے ساتھ کے لڑکے سب مجھ سے بڑے ہیں۔ لیکن مجھ کو گزشتہ سال ڈبل ترقی دی گئی تھی۔ میں نے انہیں لکھا بھی تو تھا۔ انہیں یاد تو ہوگا۔ میں اپنی کتابیں دکھاؤں گا۔ انعام کی کتابیں دیکھ کر وہ کتنے خوش ہوں گے ظہیر کا دوسرا نمبر تھا۔ اس کے باپ نے اسے فاؤنٹن پن دیا تھا۔ میرے ابا بھی ضرور مجھ کو کوئی تحفہ دیں گے۔ یہ خیالات اس کے دل میں موجیں لے رہے تھے۔ آخر وہ دن

کوششِ ناتمام

بھی آ گیا جب اس کے ابا آنے والے تھے صبح سویرے اٹھ منہ ہاتھ دھو
کپڑے بدل بچے باپ کے آنے کا انتظار کرنے لگے ۔ ۱۰ بجے ساجد آ پہنچے
ماں نے دیکھتے ہی کلیجہ سے چمٹا لیا ۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے محبت کی
شکایتیں شروع کیں ۔ " بیٹا تم تین برس میں آئے ہو ۔ ہمیں بھول ہی گئے ہو " نعیمہ
کو یاد کیا اور نعیمہ کی یاد نے نئی بہو یاد دلائی ۔ پوچھا " بیٹا دلہن کہاں ہیں ؟ وہ
دہلی نہیں آئیں ؟ " جواب ملا " آئی تو ہیں ۔ ہوٹل میں ٹھہری ہیں ۔ چلئے بچوں کو
لے چلئے ۔ ان سے مل آئیے " بڑھیا ماں اس بدتمیزی پر خون کے گھونٹ
پی کر بولی " بیٹا میں بڑھیا ان سے کیا ملنے جاؤں گی ۔ ہاں بچوں کو لے جاؤ "
اب پہلی دفعہ ساجد نے بچوں پر نظر ڈالی جو شرمائے ہوئے ایک طرف کھڑے
تھے ۔ ماں سے کہا " ان کے کپڑے تو بدل دیجئے " اس ایک جملہ نے اور اس
حقارت آمیز نظر نے جو اس نے بچوں پر ڈالی نعیم کے ولولے سرد کر دیئے
اور اسے جرأت نہ ہوئی کہ باپ سے ان باتوں میں سے ایک بات بھی کہے جو
دو دن سے سوچ رہا تھا ۔ ماں نے کہا " بیٹا کپڑے تو میں نے ان کے صبح
ہی سے بدل رکھے ہیں کہ تم آ رہے ہو "
" کیا ان کے پاس اس سے اچھے کپڑے نہیں ۔ ہاں ہیں نہیں پھر چھینے ان

کے لئے روپیہ بھیجتا ہوں" بیٹے نے ذرا بلند آواز سے کہا۔ اور ماں نے نرمی سے جواب دیا: "ہاں بیٹا پچاس روپیہ ہر مہینے آتے ہیں۔ انہیں میں کنبہ کا دینا لینا بھی مجھ کو کرنا پڑتا ہے تم تو پردیس میں ہو لیکن میں تو یہاں ہوں۔ خدا رکھے دو ہزار کے تنخواہ دار ہو۔ ہر شادی بیاہ میں اس کے حساب سے دینا لینا پڑتا ہے۔" سعادتمند بیٹے کی آواز بڑھیا ماں کی آواز سے اب اور زیادہ بلند تھی "میں روپیہ ان واہیات کاموں کے لئے نہیں بھیجتا۔ بچوں کے کپڑے اور تعلیم کے لئے بھیجتا ہوں۔ بچوں کے کپڑے اور تعلیم پر ہی خرچ ہونا چاہیئے تھا۔"

"لیکن پچاس روپیہ میں نہیں اس سے اچھے کپڑے نہیں پہنائے جا سکتے۔" ماں نے جواب دیا۔

"خیر چلو میرے ساتھ موٹر میں بیٹھو۔" ساجد نے بچوں سے کہا۔ ان کا انگریزی لہجہ اور پھر رعب نعیم کی سمجھ میں نہیں آیا۔ جس پر ساجد اور بھنائے نعیم کو کاندھے سے پکڑا اور کہا۔ "نہیں اتنی انگریزی بھی نہیں آتی؟" نعیم جس کو باپ سے پیار و محبت اور انعام کی امید تھی۔ اس کا دل ٹوٹ گیا۔ آنکھ میں آنسو آ گئے۔ جنہیں اس طرح پونچھتے ہوئے کہ کوئی نہ دیکھے موٹر میں جا کر بیٹھ گیا۔ موٹر چند منٹوں میں

کوششِ ناتمام

کناٹ سرکس میں جا پہنچی۔ آرمی اینڈ نیوی کے سامنے کار ٹھیرا کر تینوں
بچوں کو اترنے کو کہا۔ پہلے چاروں طرف دیکھا کہ اسے ایسے لباس کے
بچوں کے ساتھ کسی نے دیکھ تو نہیں لیا۔ پھر جلدی سے بلڈنگ کے اندر
چلا گیا۔ بچوں کے سکشن کا پتہ پوچھا اور تین جوڑے خرید کر وہیں بچوں کو پہنوائے
آرمی اور نیوی سے بچوں کے تین جوڑے خریدنے میں سو سے زیادہ روپیہ
اٹھ گیا لیکن اس کے باوجود بچے ویسے ہی بے ہنگم نظر آ رہے تھے۔ ساجد
کی سانولی صورت پر سفید فراک ذرا بھی نہ کھلا۔ نعیم اور نصیر کے سردی سے پھٹے
ہوئے ہاتھ پاؤں مخمل کی پتلون اور ریشمی قمیص میں اور بھی بدنما لگنے لگے۔ بالوں میں
دادی نے تیل ڈال کر کنگھی کی تھی۔ وہ سر سے چپکے ہوئے انگریزی کپڑوں
کے ساتھ بے جوڑ معلوم ہو رہے تھے۔ ساجد کو بچوں کی صورت دیکھ دیکھ کر غصہ
آ رہا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ واپس ماں کے پاس پہنچا دے لیکن نہ معلوم کیا سوچ
کر ہوٹل امپیریل پہنچے۔ جہاں لانج میں رینی میز پر کاک ٹیل آگے رکھے سگریٹ
پی رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خفگی کے آثار تھے اس نے تیوری چڑھا کر
دریافت کیا کہ وہ اتنی دیر سے کہاں تھا۔ ساجد نے معذرت کی کہ پرانی دہلی
کافی دور ہے ماں سے باتیں کرنے میں دیر لگ گئی۔ اور پھر ان بچوں کو بھی

لاتا تھا۔ ریبی نے اپنے نازک جسم کو صوفہ پر سے کسی قدر اٹھاتے ہوئے مونڈی ہوئی بھوؤں کو اونچا کرتے ہوئے کہا "See کو" ساجد نے سامنے کرسیاں کھینچ کر انہیں بٹھا دیا۔ بیچارے حیرت سے اس حسن و نزاکت کی مورت کو دیکھتے رہے۔ کمرے میں چاروں طرف چھوٹی چھوٹی میزوں پر لوگ شراب اور کاک ٹیل پی رہے تھے۔ دیواروں پہ دورِ جدید کے آرٹ کے نمونے تھے فضا سگریٹ کے دھوئیں سے مکدر تھی۔ چند منٹ کے بعد ریبی نے ازراہِ عنایت کہا: بچے کچھ پینا پسند کریں گے۔"

ساجد اس کو ریبی کی انتہائی میزبانی سمجھے۔ پانچوں وہاں سے اٹھ کر ڈیوی کو آئے جہاں ویسی ہی کرسیوں اور میزوں پہ ویسے ہی لوگ بیٹھے تھے۔ یہاں بچوں کو ایک ایک گلاس شربت کا دلوایا گیا جن میں "سٹرا" پڑے ہوئے تھے۔ ان کو نکالنے کی کوشش پر نعیم کو پھر ساجد نے ایک جھڑکی دی اور پھر موٹر میں بٹھا کر انہیں ماں کے مکان واپس پہنچا دیا۔

دوسرے دن جانے سے قبل ساجد چند منٹ کے لئے پھر ماں سے ملنے آئے لیکن نعیم کی امیدیں ختم ہو چکی تھیں۔ باپ کی جو تصویر اس کے

ذہن میں تھی وہ مٹ چکی تھی۔ باپ سے جو توقعات اس نے قائم کی تھیں وہ اب باقی نہیں رہی تھیں۔ اس نے باپ کو آتا دیکھا لیکن قریب نہیں آیا۔ جب باپ نے جاتے وقت کہا "اچھا نعیم، ہم جاتے ہیں۔ بہت محنت سے پڑھو اور اس سال اوّل آنے کی کوشش کرو" تو اس کے دل میں چھری لگی۔ باپ کو کیا معلوم کہ وہ کس محنت سے پڑھ رہا ہے اسے ڈبل پروموشن ملی اور جماعت میں اوّل آیا۔ اس کی محنت کی داد اس طرح دی گئی کہ وہ کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔

ساجد اپنے دل میں سوچتے ہوئے کہ کتنا احمق لڑکا ہے لیکن کرے کیا، بے چاری نعیمہ کی اولاد ویسی ہوتی۔ واپس ہوٹل چلے گئے۔ اور پھر جدید زندگی کی رنگینیوں اور دلچسپیوں نے بن ماں کے معصوم بچوں یعنی نعیم، نصیر اور ساجدہ کو، بڑھیا ماں کو، دہلی کی تنگ و تاریک گلیوں میں ایک چھوٹے سے گھر کو، جس کو سمجھتا تو اس کا اپنا تھا، بالکل ہی بھلا دیا۔

اس واقعہ کو ایک سال گزر گیا۔ اس دوران میں جو باپ کے برتاؤ سے اس کے دل کو ہفتوں تڑپاتا رہا اب کچھ کمی ہو گئی تھی لیکن کل سے اس تصویر کو دیکھ کر اس کے زخم پھر ہرے ہو گئے۔ وہ بار بار تصویر کا اس تصویر کے

دو پھول ساتھ نکلے

پس منظر کا مقابلہ اپنے سے اور اپنے پیش منظر سے کر رہا تھا۔ اور سوچتا تھا کہ کیا یہ سچ ہے کہ یہ خوبصورت تندرست اور ہر قسم کی دولت سے گھرا ہوا بچہ اور وہ خود بھائی ہیں۔ ایک ہی باپ کی اولاد ایک ہی درخت کے پھل۔ اس کے دل میں حسرت و یاس کی لہریں رہ رہ کر اٹھتی تھیں لیکن اسے اب تک یہ معلوم نہ تھا کہ دنیا کا کارخانہ ہی ایسا ہے کہ ؎

دو پھول ساتھ نکلے قسمت جدا جدا ہے

نوشہ نے ایک پہنا، ایک قبر پہ چڑھا ہے

ایک ہی صدف کے موتی دو ایک ساتھ نکلے

اک بس گیا کھرل میں، اک تاج میں جڑا ہے

ہمدردی

امینہ خاتون کی دوستی کو تو میں الّو کی نحوست سے تعبیر کروں گی۔ جس گھر میں ان کا قدم گیا تباہ ہو کر رہا۔ جس سے ان کا دوستانہ ہوا وہ برباد ہو گئی خدا کی قسم میں تو ان کی دوستی سے ڈرنے لگی ہوں کہ خدا ہی بچائے۔ پھر سوچا کہ آخر وجہ کیا ہے کہ جہاں کسی سے اس کا بہناپا ہوا اسی گھر میں لڑائی فساد شروع۔ نحوست تو خیر وہم ہے لیکن ایک دو نہیں تین تین گھر ان کی دوستی کے بعد برباد ہو گئے تو کیوں؟ ایک دم سے جیسے آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ تباہ کرنے والی چیز ان حضرت کی ہمدردی ہے۔ ان کی ہمدردی ہی سانپ کی طرح ان کے دوستوں کو ڈس لیتی ہے۔

کوششِ ناتمام

سیتاپور میں ناظم علی کی بیوی پہلے ان کی دوستی کا شکار ہوئیں۔ ناظم علی ادھیڑ عمر کے آدمی تھے۔ صورت شکل معمولی تھی۔ صحت بھی جیسے چالیس کے بعد ہندوستانیوں کی رہتی ہے ویسی ہی تھی۔ اس لئے اپنی عمر سے بھی پانچ برس زیادہ ہی نظر آتے تھے۔ تین بچے پہلی بیوی سے تھے۔ بڑی لڑکی شکیلہ پندرہ سولہ سال کی۔ اس سے چھوٹے دو لڑکے۔ بیوی مرگئی تو بیوی ہی کے کنبے سے ایک اٹھارہ انیس سال کی لڑکی اور بیاہ لائے۔ ابھی نئی بیوی کو آئے دو سوا دو سال ہوئے تھے۔ یہ کنبہ اچھا خاصا ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہا تھا۔ زبیدہ (یہ نئی بیوی کا نام تھا) غریب گھر کی لڑکی تھی۔ پانچ بہنیں ماں باپ کو بیاہنے اور تھیں اس کے دل میں بھی شاید یہ شکایت نہیں آئی تھی کہ ماں باپ نے دو ہاجو معمر کو کیوں بیاہا۔ شوہر کا سلوک برا نہیں تھا۔ نوجوانی کے چونچلے تو بے شک نہیں تھے۔ لیکن ویسے خاطر مدارات میں کمی نہیں تھی لیکن دراصل زبیدہ کی اصلی خوشی کا باعث بچے تھے۔ شکیلہ تو ہم عمر ہی تھی۔ دونوں لڑکے چھوٹے بھائیوں کی طرح ہر وقت چھیڑتے رہتے تھے اور دل و جان سے سوتیلی ماں کو چاہنے لگے تھے۔ ان چاروں کو آپس میں دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ سوتیلی ماں اور بچے ہیں۔ بلکہ چاروں بھائی بہن معلوم ہوتے تھے۔

ہمدردی

گرمیوں کے دنوں میں آم چوس رہے ہیں ایک دوسرے پر پانی پھینک رہے ہیں۔ جھوٹے ہاتھ پونچھنے کے لئے ایک دوسرے کو دوڑا رہے ہیں کہیں جھٹوں پر لڑائی ہو رہی ہے تو کہیں بیروں پر۔ غرض ہر وقت چہل پہل اور تفریح میں گذرتا تھا۔ اور سنجیدہ مزاج ناظم بھی دل میں خوش تھے کہ نئی بیوی کا دل لگ گیا ہے۔

یہ حالت تھی کہ پہنچیں بی امینہ خاتون۔ ان کے میاں ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر مقرر ہو کر سیتاپور آئے۔ بچوں بچوں میں دوستی ہوئی اور نوبت ماؤں کے ملنے کی آئی۔ امینہ خاتون نے زبیدہ کو پہلی مرتبہ اتفاق سے ایک مجلس میں دیکھا۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ کون ہیں تو پہلی بات جو انہوں نے کی وہ یہ کہ "اے آپ تو شکیلہ کی امی ہیں۔ ہیں! آپ تو شکیلہ کی بہن نظر آتی ہیں۔"

"جی میں شکیلہ کی امی ہوں" زبیدہ نے شرماتے ہوئے کہا "کمال ہے آپ تو بالکل بیس بائیس سال کی معلوم ہوتی ہیں شکیلہ کی امی کیسے ہو سکتی ہیں؟" اور پھر دو تین صاف صاف سوالات کئے اور بیچاری سے قبلوا لیا کہ شکیلہ اس کی سوتیلی بیٹی ہے اور پھر خود ہی بولیں "اے ہے کیسا اندھیر ہے۔ مگر

کوششِ ناتمام

بھی کیسے ظالم ہوتے ہیں بیٹی کے برابر بیوی بیاہ لانا شرم نہیں آتی۔ آپ کے والدین نے کیوں دیدیا آپ کو۔ ایسی چاند کی ایسی شکل۔ ہے ہے" اور پھر دو منٹ کے بعد" کے بہن بھائی ہیں آپ ؟" "پانچ بہنیں !" "ہاں یہی تو ! ہے۔ اب سمجھ میں آیا" پھر کیا تھا ہندوستان کی معاشرت پہ جو تبصرہ شروع ہوا تو مرثیہ خوانی چھوڑ کر سب بیبیاں اس کو سننے لگیں۔

بے چاری زبیدہ جس نے ڈھائی سال میں اب تک یہ محسوس نہیں کیا تھا کہ وہ کوئی خاص قابل رحم چیز ہے اپنے آپ کو ہر ایک کی ہمدردی کا مرکز پا کر سخت محجوب ہوئی۔ شرم اور ندامت سے عرق عرق ہو رہی تھی لیکن امینہ کی بے پناہ زبان تھی کہ قینچی کی طرح چلی جا رہی تھی اور ان کا لیکچر ختم ہوتے ہوتے زبیدہ کے دل میں بیکسی، حسرت اور مظلومی کے جذبات کا ایک طوفان اٹھ چکا تھا۔

اس شام کو جب وہ گھر گئی تو پہلی مرتبہ اس نے شکیلہ کو جھڑکا۔ شکیلہ کو اپنے "ارے میری امی کتنی دیر ہو گئی آپ کو" کہہ کر گلے میں باہیں ڈالنے کے جواب میں زبیدہ کا ہاتھ جھٹک کر اپنے کمرے میں چلے جانے پر بڑا تعجب ہوا۔ اور آنسوؤں کو پیتی ہوئی پیچھے کے دالان کی طرف چلی گئی۔

ناظم علی نے بھی یہ سین تعجب سے دیکھا۔ لڑکوں کو بھی گھر کا ماحول بدلا بدلا

ہمدردی

سا معلوم ہوا۔ زبیدہ بڑی دیر سے کمرے سے نکلیں اور باورچی خانے سے کھانا لا کر تخت پر بیٹھنا شروع کیا۔ کھانا ہمیشہ شکیلہ اور وہ مل کر لایا کرتی تھیں اور بیچ میں لڑکے کہیں کوفتہ اڑانے کی کوشش کرتے تھے کبھی مٹھائی پہلے ہی سے چٹ کر جانا چاہتے تھے غرض عجیب ہنسی خوشی سے کھانا لایا اور کھایا جاتا تھا۔ لیکن آج تو جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

لیکن دوسرے دن سب اس بات کو بھول چکے تھے۔ زبیدہ کی اپنی زندہ دل طبیعت پھر اصلی رنگ پر تھی: ناشتہ ہنسی خوشی کر کے لڑکے اپنے اپنے سکولوں کو سدھارے۔ شکیلہ اپنے سکول کو گئی۔ میاں دفتر۔

زبیدہ گھر کے کام سے فراغت پا تخت پر اپنی سلائی لے بیٹھی تھی کہ امینہ خاتون کا منحوس قدم آ پہنچا۔ ہمدردی کے پیرائے میں انہوں نے پھر خوب زہر اگلا۔ کرید کرید کر سب باتیں پوچھیں اور ہر ایک بات پر رائے زنی کی۔ "اچھا یہ دوپٹہ جس پر پائیپنگ لگا رہی ہو تمہارا ہے؟" "نہیں شکیلہ کا ہے۔" "اے تو اتنی بڑی جوان ہیلہ کا دوپٹہ تم ٹانک کر کیوں دو؟ وہ نہیں ٹانک سکتی؟ تمہیں تو اچھا بے داموں کی لونڈی بنا رکھا ہے ان بچوں نے۔ سچ تو ہے زبیدہ نے سوچا۔ زبیدہ کو یاد نہ رہا کہ یہ جالی پر کاڑھ کیا کرتا

کوششِ ناتمام

جو وہ پہنے بیٹھی ہے کیسی دیدہ ریزی سے شکیلہ نے اس کے لئے بنایا تھا۔ نہ اسے یہ یاد رہا کہ ابھی پچھلے دنوں جب اس کی طبیعت خراب ہوئی تھی تو شکیلہ نے کیسی محبت اور جانفشانی سے اس کی خدمت کی تھی۔ ڈاکٹر نے تو آٹھ دن لیٹنے کو کہا تھا لیکن شکیلہ نے اسے پندرہ دن اٹھنے نہیں دیا تھا۔

انسانی فطرت ایسی چیز ہے کہ وہ خود کو بہت آسانی سے مظلوم تصور کر لیتی ہے اور خصوصاً جب اس تصور کی کچھ بنا بھی ہو۔ اکیس سالہ زبیدہ کے لئے اڑتالیس سالہ شوہر کو اپنی زندگی کی تباہی کا باعث سمجھ لینا کچھ بہت دشوار امر نہ تھا۔ کسی اور ملک یا ماحول کی لڑکی غالباً روزِ اول سے اسی نظر سے دیکھتی لیکن کسی اور ملک یا ماحول میں اکیس سالہ لڑکیوں کی شادی اڑتالیس سالہ مردوں سے ہوتی بھی تو نہیں ہے اور جب اس ملک میں ہوتی ہے تو ظاہر ہے کہ یہ احساس ان کے دل میں پیدا ہی نہ ہو تو بہتر ہے۔

سماج کو بدلے بغیر سماج کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا کر کے کیا فائدہ لیکن امینہ بیگم کو اتنی عقل کہاں تھی۔ وہ تو دکھانا چاہتی تھیں کہ وہ آجکل کی تعلیم یافتہ خاتون ہیں معاشرت کی خامیوں سے واقف، اور ان کے خلاف مسلسل زبانی جہاد کرنا اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ اس سے ان

کو بحث نہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند دنوں کے اندر ناظم علی کے ہنستے کھیلتے گھرانے میں آئے دن لڑائی اور باہمی کشیدگی رہنے لگی اور آپس کا تنازعہ اس حد تک بڑھا کہ بالآخر زبیدہ اپنے میکے جا بیٹھی۔ اور بے چارے ناظم علی نے گھبرا کر بغیر دیکھے بھالے شکیلہ کی شادی کر دی اور اس طرح ایک کے بدلے دو کی زندگی خراب ہوئی اور جو گھر کا چین گیا وہ الگ۔

یہ گھر تباہ ہو گیا تو امینہ بیگم کے میاں سیتاپور سے بدل کر لکھنؤ آ گئے ان کے گھر کے قریب ایک نواب صاحب کا گھر تھا۔ بگڑے ہوئے نواب تھے گھر میں سوائے اللہ کے نام کے کچھ باقی نہیں تھا۔ باہر اپنی وضع کسی طرح نبا جاتے تھے۔ تین لڑکیاں جو ان بلکہ ادھیڑ عمر کی ہو گئی تھیں۔ ان کی شادیاں نہیں کرتے تھے جیسے کہ اس قسم کے لوگوں کی طبیعت ہوتی ہے کہ رسّی جل گئی لیکن بل نہیں گیا۔ گھر میں دینے کے لئے چار برتن بھی نہ تھے لیکن سوا لاکھ مہر مانگتے تھے۔ لڑکیاں پرانے طریقے میں پلی ہوئی نہ انگریزی جانیں نہ فیشن شادی کرے تو کون اور جو کرنا بھی چاہتے تھے وہ نواب صاحب کو جچتے نہیں تھے۔ بیچاریاں اپنی زندگی صبر سے گزار رہی تھیں۔ باپ کی خدمت زندگی

کا مقصد تھا۔ کبھی مہینہ دو مہینہ میں کسی عزیز کے ہاں ہو آئیں۔ یا باپ کے چوری چھپے سنیما دیکھ لیا تو عید ہو گئی۔

ان کی شومئی قسمت سے ان کے باڑے کے مکان میں امینہ بیگم آ کر ٹھہریں۔ اور ان کی ہمدردی کا زہر ان کو چڑھنا شروع ہوا۔ جیسا کہ ان کا قاعدہ تھا کہ دو چار دن بعد ہی کسی بہانے سے آدھمکیں۔ باتوں باتوں میں سارا قصہ معلوم کر لیا اور پھر کیا تھا تنقید و تبصرے کی وہی داستان دہرائی جانے لگی۔

ادئی! غضب خدا کا!! ایک چھوڑ تین تین جوان لڑکیاں بٹھا کر بڈھے کو چین کیسے آتا ہے۔ اے لو۔ خود غرضی کی بھی کوئی حد ہے۔ شادی کر دیں تو چلم کون بھرے۔ پاؤں کون دبائے۔ دنیا بھر کے شربت، مربے، معجون کوٹ پیس بنا کر کون دے۔

لڑکیاں جواب تک ناکتخدائی کی بنا باپ کے بے جا فخر خاندانی کو سمجھے ہوئے تھیں اب ان پر حقیقت کھلی کہ یہ در اصل باپ کی خود غرضی ہے اس حقیقت کی تلخی کے ساتھ مایوسی اور رنجیدگی کے بادل بھی گھر آئے۔ وہ لڑکیاں جو باوجود اپنی نہایت ہی محدود زندگی کے خوش خوش کہیں مہندی لگا رہی ہیں کہیں دوپٹہ رنگ رہی ہیں کہیں کوئی نئی طرح کی سلائی یا بتائی بنا رہی ہیں۔ اب چوبیس گھنٹے سوچی پھولی

رہنے لگیں۔ ان میں منجھلی سب سے زیادہ تیز طرار تھی اور خوبصورت بھی تھی۔ اس پر امینہ خاتون کا وار سب سے زیادہ چل گیا۔ بڑی تو خاصی عمر رسیدہ ہو چکی تھی اور چھوٹی ہنوز کم عمر تھی۔ منجھلی کی عمر پختہ ہو چکی تھی اس لئے کم سنی کی جھجک اور ڈر باقی نہ تھا۔ نہ معمری کا توازن پیدا ہوا تھا۔ اس کو امینہ نے اتنا اکسایا کہ باپ سے دوبدو باتیں کرنے لگی بڑی اور چھوٹی بہن کے لئے صاف صاف کہا۔ بیچارے نواب صاحب حیران تھے کہ یہ کیا کایا پلٹ ہے۔ لڑکیوں کی فکر انہیں بے شک تھی لیکن خدا نہ کرے یہ اندیشہ کبھی ان کے دل میں نہیں آیا تھا کہ خود لڑکیاں بھی اپنی موجودہ زندگی سے بیزار ہیں۔ پرانے زمانے کے آدمی سوچتے تھے کہ چاہے کتنی عمر ہو جائے خود اپنی شادی بیاہ کا خیال تو لڑکیوں کے دل میں آ ہی نہیں سکتا۔ منجھلی کی باتوں سے انہیں سخت دھچکا سا لگا۔ اور دبی ہوئی خاندانی غیرت بھڑک اٹھی۔ اب تک تو لڑکیوں پر کسی قسم کی پابندی نہ تھی۔ جو چاہا کرتیں جس سے چاہیں ملتیں۔ اب ایک دم سے سختیاں کرنے لگے چونکہ خود دل میں نادم و شرمندہ تھے۔ شرمندگی کا پردہ سخت گیری اختیار کر گیا۔ لڑکیاں اب تک تو باپ کی دلجوئی کے لئے اپنی بے رنگ زندگیاں گزار رہی تھیں۔ اب جب انہیں بے غیرت بے حیا وغیرہ کے خطابات ملنے لگے تو ان کا جذبۂ بغاوت جو امینہ خاتون سلگا ہی چکی تھیں اور بھڑکنے لگا۔ اور یہ امن چین کا گھر بھی تنازعہ اور کشمکش کا آماجگاہ بن گیا۔

لیکن ابھی امینہ خاتون کی تسلی کہاں ہوئی تھی۔ وہ تو قسّامِ ازل کے فیصلہ کو بدلنا اپنا فرض سمجھتی تھیں انہیں تو جب تسلی ہوئی جب منجھلی لڑکی ان کے مسموم اثر کے ماتحت ان کے یہاں کے ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی۔

اس کا اثر نواب صاحب پر اتنا زبردست ہوا کہ پہلے تو انھوں نے خودکشی کرنی چاہی اتفاق سے پکڑے گئے اور وہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی لیکن اس دن سے جو بستر پہ پڑے تو اٹھے نہیں جب تک زندہ تھے کچھ نہ کچھ صورت آمدنی کی نکال ہی لیتے تھے لڑکیاں عزت آبرو کی زندگی بسر کرتی تھیں۔ باپ کے بعد دور پرے کے رشتہ داروں کے یہاں ماری ماری پھریں۔ پھر بڑی نے مغلانی کا پیشہ اختیار کیا۔ اور چھوٹی میونسپل سکول میں استانی ہو گئی ننگِ خاندان منجھلی لڑکی کی وہ گت بنی کہ تو بہ۔ ڈرائیور شادی شدہ بال بچے دار آدمی تھا۔ بھگانے کو تو اسے بھگا لے گیا لیکن چار دن بھی آرام سے نہ رکھ سکا۔ اس کی بیوی اور بچوں کی ٹہل کرتی اور اپنی قسمت کو روتی کہ عزت گئی آبرو گئی، باپ چھٹے، بہنیں چھوٹیں اور دنیا کا آرام چین بھی نہ ملا۔

یہ خاندان تتر بتر ہو گیا تو امینہ خاتون کو اپنی توجہ کے لئے کسی اور نشانے کی تلاش ہوئی۔ اتفاق سے انہی دنوں ان کے گھر سے تین چار گھر دور ایک پنجابی گھرانا آ کے ٹھہرا۔ اور امینہ خاتون کے کان میں یہ بھنک پڑی کہ اس گھر میں دو بیویاں تھی

ہمدردی

بھلا ایسی نامناسب بات سن کر اس کا تدارک کئے بغیر وہ رہ سکتی تھیں بغور اکسی نہ کسی صورت سے میل جول پیدا کیا اور آنے جانے کا سلسلہ قائم کر لیا۔

ایک سیدھا سادہ گھرانا تھا۔ میاں کاروباری آدمی تھے۔ پہلی بیوی سے اولاد نہ ہونے کی وجہ سے خود اس کی رضامندی سے دوسری شادی کی تھی۔ دوسری بیوی پہلی بیوی کا بہت ادب لحاظ کرتی تھی۔ پہلی ہی کے ہاتھ سارا خرچ انتظام تھا۔ دوسری کے بچے بھی انہی کے پاس رہتے تھے۔ چین سے زندگی بسر ہو رہی تھی۔ یہ تو نہیں تھا کہ ان کے دل میں کبھی بھی ایک دوسرے کی طرف سے رنج یا حسد پیدا نہ ہوتا ہو۔ ہوتا ضرور تھا۔ ہوتا ضرور تھا لیکن اتنا ہی جتنا کہ دیورانی جیٹھانی ساتھ رہیں تو ان میں پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن ان کے دل میں بغاوت کی آگ نہیں بھڑک رہی تھی۔ نہ ہی حقوقِ نسواں کے جذبات موجیں مار رہے تھے کہ ان کی زندگی اجیرن ہو جائے اور نہ ہی بیچارا نصیر احمد "سوکن کا جلایا" یا "شہید بیگم" کے جیسا ظالم شوہر تھا۔ معمولی اوسط درجہ کے لوگ تھے۔ اوسط درجے کے ہی ان کے جذبات و خیالات تھے اور اگر امینہ خاتون کا قدم ان کے درمیان نہ آتا تو اسی طرح ان کی زندگی کے دن بسر ہو جاتے۔ لیکن ان کی ڈرامیٹک شخصیت کا اظہار ان کی سادہ زندگیوں سے ہی ہوتا ہے۔ ان میں بھی تگ و دو پیدا ہو گیا۔

کوشش ناتمام

اور اس کشمکش کی سہار انھیں نہ ہو سکی۔

امینہ خاتون نے جیسا کہ ان کا قاعدہ تھا فوراً ہی اس بات پر انتہائی استعجاب کا اظہار کیا کہ تم دونوں سوکنیں اکٹھے رہتی ہو۔ میاں کو دوسری شادی کا اتنا شوق ہے تو کم سے کم۔ . . . . الگ تو رکھا کریں۔ تمھیں اس کی برداشت کیسے ہوتی ہے اور پھر دوسری شادی کی وجہ، بچوں کی دیکھ بھال کے متعلق ذرا ذرا سی باتیں سب کچھ معلوم کرلیں۔

پہلی بیوی کو اوّل اس بات کا یقین دلایا کہ دوسری شادی کر کے اس کے میاں نے اس پر انتہائی ظلم کیا ہے۔ اس کے میاں سے بڑھ کر ظالم شخص دنیا میں نہیں۔ اور مہذب سوسائٹی میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ بے چاری، ادرہ جو ہندوستانی تعلیم و تربیت کے ماتحت خود ہی کو خطادار اور میاں کو مہربان تصور کرتی آئی تھی ایک دم سے خود کو مظلوم اور میاں کو ظالم سفاک سمجھنے لگی۔ اب تک اس کا خیال تھا کہ باوجود اولاد نہ ہونے کے اور دوسری شادی کر لینے کے یہی غنیمت تھا کہ میاں اس کی عزت کرتے ہیں اور دوسری بیوی بھی ادب سے پیش آتی ہے میکے میں کوئی ٹھکانہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ اسے غنیمت معلوم ہوتا تھا لیکن اب اس کے جذبات میں بالکل تبدیلی ہو گئی۔ بجائے میاں کے آرام کا خیال

ہمدردی

دیکھنے کے اس نے کاموں کی طرف سے یکسر بے پرواہی شروع کردی ظاہر ہے
کہ اس کے بدلے ہوئے تیور کا میاں اور سوکن پر بھی اثر ہوا۔ اب تک جو وہ لوگ
اس سے اچھا سلوک کرتے آئے تھے تو یہ صرف ان کی شرافت نہ تھی بلکہ اس
سے دونوں کا فائدہ تھا۔ ان کے معیارِ اخلاق نہ بہت بلند تھے اور
نہ رفیع۔ میاں نے فوراً ہی اس پر ظاہر کرنا شروع کیا کہ اس طرح بدمزاجیاں اٹھا
کر اسے روٹیاں دینے سے رہا۔ چھوٹی بیوی نے بھی طعن و تشنیع کا سلسلہ کھول دیا
اور نادرہ جواب تک صحیح معنوں میں مظلوم نہ تھی امینہ خاتون کے طفیل سچ مچ
مظلوم ہو گئی۔

شاید اگر اب بھی امینہ خاتون اس کو بھڑکاتی نہ رہتیں تو اس کو عقل آجاتی اور
اب بھی وہ اپنے رویہ کو بدل دیتی لیکن اس کی بدقسمتی سے امینہ موجود تھیں اور اس کی ہمدردی
کے پیرایہ میں روزانہ آگ پر تیل ڈالتی رہتی تھیں۔

اے ہے بی معلوم نہیں تمہارا کیسا پتا ہے۔ میں ہوتی تو موذی کو چیر کر رکھ دیتی (یا اگر
اپنی اصلی طبیعت کے ماتحت نادرہ سوتیلے بچوں سے پیار سے بول لیتی) اور اس چڑیل کو ایسی سناؤں
کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ تم ڈرتی کس بات سے ہو۔ حق تمہارا ہے۔ پہلی بیوی تم ہو
ہم تو عورتوں کی کانفرنس میں ایسا ریزولیوشن پیش کرنے والے ہیں کہ جس کے

ذریعہ دوسرا نکاح قانونی طور سے ناجائز قرار دیا جائے وغیرہ وغیرہ۔

نادرہ جس کے دل میں پہلے ہی سے احساسِ کمتری اور محرومی کے جذبات بھرے پڑے تھے جو کہ کسی نہ کسی طرح صبر و ضبط کی مہران پر لگائے زندگی کے دن گزار رہی تھی۔ ان باتوں سے ایکدم ہی بے قابو ہو گئی۔ اس نئے وزانہ گھر میں وہ دانتا کل کل شروع کی کہ میاں اور سوکن کا ناک میں دم آگیا یہاں تک کے ایک دن تنگ آ کر میاں نے طلاق دیدی۔ اب اس بدنصیب کی آنکھیں کھلیں۔ میکے میں کوئی تھا نہیں۔ جاتی تو کہاں۔ امینہ خاتون جن کا یہ سب کچھ کیا دھرا تھا اپنے گھر میں ایک روز ٹھہرانیکی روادار نہ تھیں۔ ہاں اگومتی کی موجیں اپنی آغوش ایسے بے کسوں کے لئے ہمیشہ کھولے رکھتی ہے۔ اور بدنصیب نادرہ کو بھی اس نے پناہ دی۔

اس واقعہ کے بعد امینہ خاتون کے میاں کا تبادلہ لکھنؤ سے ہو گیا۔ خدا جانے ان کا منحوس قدم کہاں گیا۔ اور کس کس کو برباد کریگا۔ ہندوستان کے چالیس کروڑ انسان رسم و رواج اور مذہب و اقتصادیات کی عجیب و غریب الجھنوں میں گرفتار ہیں۔ بیسویں صدی کے نوساختہ سیاسی یا معاشرتی قوانین اخلاق ایک دم سے ان پر عائد کرنے کی کوشش کا نتیجہ معاشرتی انتشار کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

شانتی

ہم لوگ زہرا کے ڈرائینگ روم میں بیٹھے چاء پی رہے تھے۔ لیلا نے چائے کی پیالی میں شکر ڈالتے ہوئے پوچھا "کیوں زہرا مالتی کو نہیں بلایا؟"

"بلایا تو تھا، لیکن اب تک وہ ہسپتال میں ہے"

"ہسپتال میں کیوں؟" ہم سب نے ایک آواز سے پوچھا۔

"آپریشن کرایا ہے" زہرا نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"آپریشن کیوں۔ کاہے کے لئے؟" ایک دو نے فکریہ لہجہ میں پوچھا۔ لیکن باقیوں کے چہرے کو دیکھ کر فکر استعجاب میں بدل گیا۔

کوششِ ناتمام

"تم سب ہنس کیوں رہی ہو، کیا بات ہے؟ ہمیں تو بتاؤ۔" لیلا نے اور ہم نے زہرا اور املا وغیرہ سے کہا۔

"جیسے آپ کچھ جانتی ہی نہیں ہیں۔ جناب یہ تو آپ لیڈی ڈاکٹروں ہی کی مہربانی ہے کہ جس عورت کا دل چاہے ماں بننے کی مصیبت سے بچ جائے۔" زہرا نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔

"اچھا یہ بات ہے۔" پھر ایک دم سے سب کی سب نے اس موضوع پر رائے زنی شروع کی۔

میں ان کی گفتگو خاموشی سے سنتی رہی۔ میری نظروں کے نیچے شانتی کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اور خوفزدہ چہرہ پھر رہا تھا۔

اُف! سوسائٹی کتنی ظالم، کتنی سنگدل، کتنی منافق تھی۔ اس کے قوانین کس طرح آہنی زنجیروں کی طرح غریبوں کے ہاتھ پاؤں، ان کی روح تک کو جکڑے ہوئے تھے۔ اور یہ روپیہ کی کنجی سے امیر اس کو آسانی سے کھول کر الگ پھینک دیتے تھے۔

"آپ کیا سوچ رہی ہیں؟" زہرا نے میری خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں صرف یہ کہ روپیہ والوں کے لئے دنیا میں کتنی آسانیاں ہیں۔ غریب یہی کرنا چاہیں تو جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔"

"رہنے بھی دو، تم تو ایسی فضول باتیں کرتی ہو۔ غریب عورتوں کو تو کوئی دقت نہیں ہوتی۔ روز حرام زادیاں یہی کرتی رہتی ہیں دقت تو ہمیں ہوتی ہے، ڈاکٹروں کی خوشامد کرو، پچاس بہانے کرو، ڈبل فیس دو۔ تو کہیں جاکر راضی ہوتے ہیں۔"

"اور کیا۔" ادملا بولیں۔ "آخر ڈاکٹر مارٹن نے امرتا کے دفعہ میری ایک نہ سنی۔ ہزار میں نے کہا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے دو بچے ہی مجھ سے نہیں سنبھلتے، میں مرجاؤں گی لیکن نہ راضی ہونا تھا نہ ہوئی۔ اور ان کمینوں کا کیا، دنیا بھر کی بدمعاشیاں کریں اور ایسے گر معلوم ہوتے ہیں کہ صاف بچ جاتی ہیں۔"

"میم صاحب۔ ڈاکٹر میم صاحب میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں پیر پڑتی ہوں، بھگوان کے لئے مجھ پر کرپا کرو۔ یہ پاپ میری جان سے دور کرو۔ میم صاحب میں تمہارے پیر پڑتی ہوں، میم صاحب میرا آدمی مجھے مار ڈالے گا۔" شانتی کا یہ کہہ کر لرزتے ہوئے میرے

پاؤں پر گرنا مجھے یاد آگیا۔ اس کی آنکھوں میں کتنا خوف تھا، کتنا ڈر تھا، کتنا زیادہ ڈر، وہ آنکھیں مجھے نہیں بھولتیں اب بھی نہیں بھولتیں، اس کی چیخ اس جانور کی چیخ کی طرح تھی جس کے پیچھے شکاری آرہا ہو۔

شانتی صرف دو دن ہسپتال میں زندہ رہی۔ بلکہ صرف ڈیڑھ دن اور دو راتیں، اس میں زیادہ وقت اس پر غشی کا عالم تھا لیکن بیہوشی میں بھی خوف، سخت خوف، اس پر طاری تھا، جب ہم لوگ اس کو ہاتھ لگاتے یا اس کے قریب آتے تو وہ ایک دم سے اٹھ بیٹھتی یا بھاگنے کی کوشش کرتی، کبھی چلاتی، "مجھے مت نکالو میم صاحب، مجھے مت نکالو، میں کہاں جاؤں گی۔ میں تمہارے دروازے پڑی رہوں گی، میم صاحب مجھے معاف کردو۔" کبھی چلاتی "مت مارو۔ مجھے مت مارو۔"

ایک دفعہ اس کی نبض دیکھ رہی تھی، تو اس کو دھیرے دھیرے کہتے سنا "میری شال بھی لے لی۔ میری شال بھی لے لی۔"

"کس نے" میں نے نرمی سے پوچھا۔

"میرے آدمی نے سب چیزیں لے لیں۔ میرے بیں توسے کے پاؤں

شانتی

کے توڑے تھے۔ بیس تو لے وہ بھی لے گئے اور شال بھی، میری لال شال، کلکتہ میں لی تھی بارہ روپیہ کو، وہ بھی لے لی"۔ یہ کہہ کر وہ اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دی جیسے کہ وہ بچہ جس سے کہ کوئی کھلونا چھین لے۔

یا اللہ! یہ کون ہے۔ مجھے اس سے بے حد ہمدردی پیدا ہو گئی تھی، وہ بیس بائیس سال کی معلوم ہوتی تھی اور اس کی زبان دیہاتیوں جیسی تھی، اس کی صورت باوجودیکہ سخت درد و کرب میں مبتلا تھی، بہت ہی بھولی بھالی تھی، جسم گول گول بھرا بھرا، رنگ سانولا مگر نمکین۔ یہ اندازہ لگانا ممکن نہ تھا کہ یہ لڑکی دیہاتی خوبصورتی کا نمونہ ہو گی اگرچہ اس وقت چہرے سے سوائے انتہائی انتشار کے اور کسی چیز کا پتہ نہیں چلتا تھا۔

وہ کوئی ساڑھے تین بجے ہسپتال میں داخل ہوئی۔ اس کے قے ہو رہی تھی اور برابر قے ہوئے جاتی تھی، اور اس کی آنکھیں اور جسم زرد ہونے لگا تھا ساتھ ہی اس کی کمر میں سخت درد تھا۔ اور وہ مرغی کی طرح تڑپ رہی تھی۔

میں تو صرف ہاؤس سرجن ہوں۔ بڑی ڈاکٹرنی نے سخت قسم کا جانڈس تشخیص کیا۔ رات کے نو بجے جب میں ڈیوٹی پر آئی اور شانتی نے

کوشش ناتمام

بلک کر کہا "میم صاحب بھگوان کے لئے میم صاحب میرے پر دیا کرو۔ میری جان بچاؤ۔ میرا پاپ نکال دو۔" تو اصل قصہ کا پتہ چلا۔

"تم نے کیا کھایا تھا بتاؤ۔"

"کچھ نہیں میم صاحب کچھ نہیں۔" اس نے ڈری ہوئی آواز سے کہا۔

"دیکھو شانتی ہم ڈاکٹر ہیں اگر ہم سے بھی سچی بات چھپاؤ گی، تو ہم کیسے تمہارا علاج کر سکیں گے۔ بتاؤ کیا کھایا تھا تم نے؟"

"دوائی میم صاحب"

"کیسی دوائی؟"

"معلوم نہیں میم صاحب میرے دن چڑھ گئے تھے، اس کے واسطے میم صاحب۔"

میں بڑی ڈاکٹرنی کے پاس گئی، میں نے کہا "میرے خیال میں اس کو کسی نے گندھک کا ست دیا ہے اس سے جانڈس کے آثار پیدا ہو گئے ہیں" میری تشخیص کو صحیح مانتے ہوئے فوراً بڑی ڈاکٹرنی نے "باؤل واش" وغیرہ کا حکم دیا۔

"اور ڈاکٹر" میں نے دبی زبان سے کہا "اگر اس کو کیورٹ کرا دیجئے

تو اس کے دل سے بڑا بوجھ اتر جائے گا اور یہ بچ جائے گی۔ وہ دہشت سے مری جا رہی ہے۔"

"میں اور کچھ نہیں سننا چاہتی۔" ڈاکٹرنی نے اپنی کرخت آواز میں مجھ سے کہا۔ "تم جانتی ہو میڈیکل پروفیشن کا کیا اصول ہے اور تم جو کچھ کہہ رہی ہو وہ کتنا بڑا جرم ہے۔"

"جی۔ جان بچانے کے لئے۔" میں نے پھر ہمت کر کے کہا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ شانتی ہول اور خوف سے مری جا رہی ہے۔" اگر اس کے خوف کی بناء دور کر دی جائے تو وہ بچ جائے گی۔"

لیکن جسم کے ڈاکٹر دل کی بیماری کو کیا سمجھتے، ذہنی کیفیت کا کیا خاک اندازہ لگا سکتے۔ ڈاکٹر نے کیورٹنگ کی اجازت نہ دی۔ اور میں ناامید ہو کر شانتی کے پلنگ کے پاس بیٹھ گئی۔

اسے اب تک ہوش تھا "میم صاحبہ مجھ پر دیا کرو میم صاحبہ اس نے پھر بلک کر مجھ سے کہا۔ اتنے میں بڑی ڈاکٹرنی خود آ پہنچیں اور انہوں نے بڑی سختی کے ساتھ شانتی سے کہہ دیا کہ اس کو نجات نہیں دلائی جائے گی بلکہ ہر ممکن کوشش کی جائے گی کہ وہ اس آفت میں مبتلا رہے۔ ہاں۔ جان بچائی

کوشش ناتمام

بچانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی جیسے پیاسے کو پانی نہ ملے ویسی ہی مایوسی شانتی کے چہرے پر چھا گئی۔ ایک جگر شگاف چیخ کے ساتھ وہ میرے پیروں پر آگری اس کے بعد پھر اس پر غشی طاری ہو گئی۔ لیکن غشی اور غنودگی کے عالم میں بھی خوف، جگر ہلا دینے والا خوف اس کے دل سے مٹ نہ سکا۔

رات بھر میں اس کے پاس بیٹھی اس کے کرب و بے چینی کو دیکھتی رہی صبح میرا "آف ڈیوٹی" کا وقت تھا لیکن میں شانتی کو بھلا نہیں سکی دو دفعہ دیکھنے آئی۔ دوپہر کے بعد معلوم ہوا کہ بڑی ڈاکٹرنی صاحبہ نے کیوریٹنگ ضروری سمجھا اور اجازت دیدی۔ لیکن افسوس اب شانتی بالکل بے ہوش تھی اس کی سانس میں گڑگڑاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ میرے کئی بار آوازیں دینے پر اس نے آنکھیں کھولیں پر ان میں موت کی دھند چھا چکی تھی۔ میں نے کہا "شانتی تمہارا آپریشن کر دیا اب فکر کی بات نہیں"

اس نے لڑکھڑاتی آواز سے کہا "ہاں لڑکی کچھ روز کی ہو کر مر گئی کس کی لڑکی شانتی" میں نے پوچھا "میری لڑکی گڑیا جیسی تھی چھ روز کی" اور

شانتی

اس کی آواز پھر بیٹھ گئی۔

اس روز رات کے نو بجے شانتی کے کرب و بے چینی کا خاتمہ ہو گیا۔ موت سے اس کے چہرے پر اطمینان اور سکون چھا گیا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ سی آگئی۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے پلنگ کے آس پاس چادر کھینچ دی اور باہر نکل آئی۔

اس کا کوئی وارث نہیں تھا۔ صرف اس کی ایک جان پہچان عورت اور اس کا شوہر جس کے یہاں وہ نوکر تھی۔ ان کے کہنے پر آکر لاش کو لے گئے۔

شانتی کی زندگی کا قصہ کیا تھا میں معلوم نہیں کر سکی۔ اس کی جان پہچان عورت نے صرف اتنا بتایا کہ شانتی جے پور کی رہنے والی تھی اس کے شاید دو بھائی اب بھی زندہ ہیں۔ ماں نے اس کی شادی چھوٹے پن میں کر دی تھی۔ شوہر بڑا ظالم تھا، جب تک ماں زندہ تھی اس کے پاس بھاگ بھاگ آتی رہی۔ لیکن ماں کے مرنے بعد بھائی بھاوجوں نے منہ نہیں لگایا۔ اور وہ ہر طرح کے ظلم سہتی اور برداشت کرتی رہی۔ یہاں تک کہ شوہر نے کلکتہ لے جاکر وہاں پردیس میں اسے گھر سے

نکال دیا۔ اس عورت سے اتفاقاً ملاقات ہو گئی اس نے رحم کھا کر اپنے
گھر میں پناہ دی اور نوکر رکھوا دیا۔ دس مہینے سے نوکر تھی اور بڑی خوش
مالکہ بہت مہربان تھیں لیکن بہت سخت مزاج۔ آوارگی کی بھنک بھی
سن لیتی تو نکال باہر کر دیتی لیکن جوانی دیوانی ہوتی ہے شانتی کا قدم
لڑکھڑا گیا اور قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے انہی دنوں اس کا شوہر جو
فوج میں چلا گیا تھا اور لاپتہ ہو چکا تھا۔ واپس آ گیا اور اس کو واپس لے جانے
کے لئے اصرار شروع کیا۔

شانتی، بھولی کم عمر ناتجربہ کار شانتی، اس کے ہوش غائب ہو گئے
وہ قصائی شوہر جس نے بے قصور بھی توہڈیاں توڑی تھیں وہ اب جبکہ
قصوروار بھی کیا نہ کرے گا۔

وہ خوف اور دہشت سے پاگل ہو رہی تھی۔ ایک ایک سے ہاتھ
جوڑ کر اپنے درد کا درماں پوچھتی تھی۔ لیکن گنہگار سے کسے ہمدردی
ہوتی ہے؟ ہر کوئی نفرت سے منہ پھیر لیتا تھا۔ ادھر ظالم شوہر روزانہ
دھمکیاں دیتا تھا کہ اگر اس کے پاس واپس نہیں آئی تو نالش کر دے گا۔
شانتی پر کیا گزری ہو گی۔ کیا کیا ذہنی اضطراب۔ کیا کیا ہول اور فکر

شانتی

اس نے برداشت کئے ہوں گے اور اس طرح کہ کسی کو اس آگ کا پتہ نہیں چلا جو کہ اس کے سینے کے اندر جل رہی تھی۔

پتہ نہیں اس نے گھبراہٹ میں کیا کیا بلا کھائی ہو گی اس کا بدن مرنے کے بعد نیلا کانچ ہو گیا تھا اور بیماری کے دوران میں پیلا ہلدی۔ پوسٹ مارٹم ہوتا تو معلوم ہوتا کہ اس جان ہار نے کس طرح اپنی جان دی۔

مرتبہ:۔ خولہ محمد شفیع